اِک لڑکی چھوٹی سی



"محبت کی حد وہاں سے شروع ہوتی ہے، جہاں سے اختیار کی حد ختم ہو جاتی ہے"

اُس کے معصوم چہرے پر اُداسی تھی، نازک جسم نڈھال تھا اور ـــــ بے جان قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

سوٹ کیس ہاتھ میں تھامے سیڑھیاں اُترتی وہ ایک پل کو لینڈنگ میں رُکی۔ نیچے ہال پر نگاہ کی۔

عقبی دروازے کے پاس سیاہ سوٹ میں ملبوس ایک اجنبی کھڑا تھا، کوٹھی کے مرتہن کا آدمی تھا شاید۔ سیڑھیوں کے اختتام پر بیرسٹر عرفان احمد سر جھکائے مغموم کھڑے تھے اور ـــــ دُور بیرونی دروازے کے قریب رحمت بابا کھڑے آنسو پونچھ رہے تھے۔

باقی کی سیڑھیاں اتر کر وہ باہر کی طرف بڑھی۔ بیرسٹر عرفان احمد ساتھ ہو لئے۔ رحمت بابا اُس کا سوٹ کیس لے کر پیچھے پیچھے چل پڑے۔

پورچ میں کھڑی وہ اپنی خوبصورت سپورٹس کار کی طرف بڑھی۔

مگر ـــــ دوسرے ہی لمحے وہاں کھڑے دو اجنبی اُس گارڈ کو اپنی طرف گھورتے دیکھ کر ـــــ وہ پیچھے ہٹ آئی۔

احساسِ ندامت سے اداس چہرے پر زردی کھنڈ آئی ـــــ محرومیت کے خیال سے خوبصورت آنکھوں میں کرب اُتر آیا۔

"آؤ بیٹی"۔ بیرسٹر عرفان احمد نے شفقت سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

اور۔۔۔ اُس کے ڈولتے وجود کو سہارا دیتے ہوئے قدرے فاصلے پر کھڑی اپنی کار کی طرف بڑھے۔

''میڈم''۔ کچھ دیر قبل ہال میں کھڑا سیاہ سوٹ والا شخص عجلت میں اُس کے قریب آیا۔

''ابھی ابھی مسٹر خان کا فون آیا ہے، وہ آپ سے ملنے آرہے ہیں''۔

مسٹر خان! جو اب شہر سے باہر آبادی سے پرے اس وسیع وعریض محل نما کوٹھی کا مختار تھا۔ یہاں کے لہلہاتے کھیتوں کا، خوبصورت اصطبل کا، گولف کورس کا، سوئمنگ پول کا ۔۔۔ حتیٰ کہ تمام نوکروں چاکروں کا بھی ۔۔۔ کوٹھی جو اُس کی اور اُس کے پاپا کی اپنی تھی ۔۔۔ کھیت جہاں وہ اکثر دور تک اپنی گھوڑی پر نکل جایا کرتی تھی، اصطبل جہاں اُس کی نیلی تھی پاپا کے قیمتی گھوڑے تھے، گولف کورس جہاں پاپا اور بیرسٹر انکل گولف کھیلا کرتے تھے، سوئمنگ پول جو خاص طور سے پاپا نے اُس کے لئے بنوایا تھا ۔۔۔ نوکر چاکر ۔۔۔ جو اُس پر جان دیتے تھے۔

''کہہ دیں اُن سے میں نہیں مل سکتی''۔ اچانک ہی جیسے اُس کے بے جان جسم میں جان آگئی۔ اُس کی آواز تیز تھی، لہجہ تلخی لئے تھا۔

چند ثانیے قبل کی اپنی ندامت کا ردِ عمل تھا شاید ۔۔۔ اپنی املاک کے یوں چھن جانے کا غصہ تھا غالباً۔

''مگر وہ چل پڑے ہیں...''

''تو کیا ہوا''۔ کندھے اچکاتے ہوئے وہ آگے نکل آئی۔

''پلیز میڈم''۔ وہ پھر آگے بڑھا۔ ''وہ آپ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔

''ہر ضروری بات ہماری وکیل کے ذریعے ہو چکی ہے''۔ وہ اب بھی کار کی طرف بڑھ رہی تھی۔

''پلیز ۔۔۔ وہ پہنچنے والے ہوں گے''۔ آدمی کا لہجہ التجا لئے تھا، اپنے مالک کا خوف غالب

تھا جیسے۔

''میں نے کہہ دیا نا نہیں ملوں گی''۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اُس نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔ بیرسٹر عرفان خاموشی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے۔

''بیٹی اپنا خیال رکھیئے گا''۔ بھرائی سی آواز اُس کے کانوں میں پڑی۔

یہ رحمت بابا تھے۔ جب سے اُس نے آنکھ کھولی تھی انہیں اپنے اردگرد پایا تھا۔ ہمدرد، مشفق رحمت بابا۔

وہ پھر اپنی دُنیا میں آگئی۔ وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر جا رہی تھی۔

گھر بار۔ ہمدرد چہرے، مشفق لوگ۔

''بابا''۔ کھڑکی میں رکھے اُن کے جھریوں بھرے ہاتھ پر عقیدت سے اپنا سر ٹکاتے ہوئے وہ بڑے ضبط سے بولی۔ ''آپ بھی اپنا خیال رکھیئے گا''۔

بابا نے اس کا سوٹ کیس پچھلی سیٹ پر رکھا ۔۔۔ اور گاڑی چل پڑی۔

سفیدے کی دورویہ قطاروں میں سے گزرتی، بجری کی سڑک پر چلتی گاڑی، مضبوط آہنی گیٹ کے پاس پہنچی ۔۔۔ تو نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے مُڑ کر دیکھا۔

محلاتی شان کی کوٹھی اداس تھی، قد آور درخت مغموم تھے، ذرہ ذرہ ماتم کناں تھا۔

پھر ۔۔۔ ہر چیز دھندلا گئی، بھیگ گئی۔

اُس نے جلدی سے رُخ واپس پھیر لیا۔ چپکے سے آنسو پونچھ لئے۔

''تمہارے پاپا کی وصیت کے مطابق میں نے تمہارے باہر جانے کے تمام انتظامات مکمل کر لئے ہیں''۔ سڑک پر نظر جمائے بیرسٹر عرفان اداسی سے گویا ہوئے۔ ''اتوار کی فلائیٹ سے تم اُن کی منہ بولی بہن کے پاس روانہ ہو جاؤ گی''۔

وہ کچھ نہیں بولی۔ چپ چاپ باہر خلاؤں میں تکتی رہی۔

بیرسٹر عرفان کٹ کر رہ گئے۔ دُکھ سے اُس کی طرف دیکھا۔

نازونعم میں پلی معصوم سی سترہ سالہ مشعل، کتنی شوخ، کتنی چنچل ہوا کرتی تھی چند روز قبل تک ـــ ایک پل نچلی نہیں بیٹھتی تھی، اودھم سا مچا رہتا تھا اس کی موجودگی میں۔

انہوں نے افسردہ سی سانس لی۔

''تمہاری آنٹی اب بھی مُصر ہیں کہ تم ہمارے پاس رہو''۔ وہ پھر سامنے دیکھنے لگے۔

''دراصل وہ تمہیں ذوالفقار علی کی امانت سمجھتے ہوئے...''

ذوالفقار علی ـــ اُس کے پاپا، جو چند روز قبل انتقال کر گئے تھے۔ اُن کا ہارٹ فیل ہوا تھا۔

کچھ دن پہلے وہ اپنی لائبریری میں آرام چیئر پر نیم دراز کسی کتاب کے مطالعے میں محو تھے۔ وہ بھی وہیں کھڑکی میں کھڑی دور تک پھیلے ہوئے سرسبز کھیتوں کے اُس پار سرمئی پہاڑ کے پیچھے ڈوبتے سورج کو دیکھ رہی تھی۔

تبھی ـــ بیرسٹر انکل آ گئے۔ وہ کچھ پریشان سے لگ رہے تھے، کچھ کہنا چاہتے تھے مگر جیسے کہہ نہیں پا رہے تھے۔

پھر بھی بول ہی پڑے کہ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔

''تمہارے پارٹنر نے تمہارے ساتھ دھوکہ اور چالبازی کی ہے ذوالفقار۔ کچھ کاغذات کے بل پر جن پر تمہارے دستخط تھے کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ اور جس کی وجہ سے قانون کے ریکارڈ میں تمہاری ساری پراپرٹی گورنمنٹ نے سیل کر دی ہے''۔

پاپا کے ہاتھوں سے کتاب چھوٹ گئی۔ آنکھوں میں کرب تڑپنے لگا اور ـــ پھر انہوں نے تکلیف کی شدت سے بے تاب ہو کر سینہ تھام لیا۔ اُنہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔

'' نور خان نے میرا سب کچھ چھ... چھین لیا ہے... س... سوائے اِس ... کوٹھی کے...''۔

اور ـــ وہ پاگلوں کی طرح کمرے سے بھاگ نکلی تھی۔ ڈاکٹر کو فون کرنے ـــ رحمت بابا کو بلانے۔

واپس آئی ـــ تو پاپا اسے ہمیشہ کے لئے اکیلا چھوڑ کر ـــ خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔

وہ چیخی تھی، روئی تھی ـــ کہ اس دنیا میں اب اس کا اپنا کوئی نہ رہا تھا۔ وہ تنہا رہ گئی تھی، بالکل اکیلی ـــ خدا کے بعد اگر سہارا تھا تو بیرسٹر انکل کا۔

وہ پاپا کے بچپن کے دوست تھے، دونوں اکٹھے پڑھے لکھے تھے، اکٹھے ہی وکالت پاس کی تھی۔ پھر پاپا نے دادا جان کی وفات پر آبائی جائیداد کے ساتھ ساتھ اُن کی بزنس سنبھال لی تھی۔ اور انکل بیرسٹری کرنے کے بعد اپنی پریکٹس کرنے لگے تھے۔ آبائی گاؤں سے دُور اِس علاقے میں آن بسنے میں بزنس کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ دونوں دوستوں کی قریب رہنے کی دیرینہ خواہش بھی شامل تھی۔

پاپا کی وفات پر وہ بھی نیم جان نظر آتے تھے۔

''اُسے پہلے ہی خدشہ تھا'' کل ہی انکل اُسے بتا رہے تھے۔ ''دو ایک پارٹنرز اُس سے بُری طرح حسد کرنے لگے تھے۔ پچھلے ماہ اس کے جوکی کو بھاری رقم دے کر ریس میں انہی لوگوں نے اُس کا گھوڑا ہروایا تو اُسے یقین ہو گیا وہ آگے بھی باز نہیں آئیں گے۔ وہ بہت پریشان رہنے لگا تھا۔ کہتا تھا بزنس بذاتِ خود ایک روگ ہے مجھے اکثر لگتا ہے میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ میں اُسے بہت تسلی دیتا تھا مگر ـــ وہ بے چین ہی رہتا''۔

''مجھے کچھ ہو گیا عرفان تو مشعل کو ملک سے باہر میری منہ بولی بہن ہاجرہ کے پاس بھجوا دینا۔ اُس پر مجھے مکمل اعتماد ہے، مال و دولت والی نہیں مگر بھروسے والی ضرور ہے...'' مرنے سے کچھ ہی دن قبل وہ کہنے لگا۔

''ایسی باتیں کیوں سوچتے ہو، تمہیں خدانخواستہ کیوں کچھ ہونے لگا''۔ میں نے کہا۔

"پتہ نہیں کیوں ۔۔۔ دل بس جیسے یہی کہہ رہا ہے"۔ ذوالفقار جیسے آنے والے خطرات پیشگی بھانپ گیا تھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو"۔ میں نے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"خُدا کرے سب ٹھیک ہو۔ مگر ۔۔۔ کچھ ہو گیا تو مشعل کو فوراً ملک سے باہر بھیج دینا، ذرا تاخیر مت کرنا..."

میں جو ہوں یہاں۔ اُسے باہر بھیجنے کی کیا ضرورت ہے"۔

"ہے عرفان۔ وہ اکیلی پیچھے رہ گئی تو ایسا نہ ہو یہ بدذات اُسے بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کریں..."

"اچھا اچھا جیسے تم چاہو گے ویسا ہی ہوگا"۔ میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

وہ پُرسکون سا نظر آنے لگا۔ جیسے تمہاری طرف سے مطمئن ہو کر اب وہ کسی بھی خطرے کا مقابلہ کر سکتا تھا۔

اور پھر ۔۔۔ وہی ہوا ۔۔۔ جس کا ڈر تھا۔ بلکہ اُس سے بھی زیادہ۔ اُس کی تمام جائیداد سیل کروا کر اُس کے پارٹنر نے اُسے پائی پائی کا محتاج کر دیا۔

"عرفان... کوٹھی فوراً مسٹر خان کے پاس گروی رکھوا دو... رقم سے مشعل... کی دیکھ بال کرنا... اُسے... فوراً ہاجرہ کے پاس... بھیج... دو..."۔ دم توڑتے توڑتے اُس نے مجھ سے کہا"۔

مشعل کو کوٹھی گروی رکھوانے سے متعلق کوئی علم نہ تھا۔ پاپا کو اٹیک ہوا تھا تو وہ تو بدحواس ہو کر ڈاکٹر کو فون کرنے بھاگی تھی۔ انکل نے بھی کل ہی سب بتایا۔ اُسے تو پاپا کی پریشانیوں کا علم ہی نہ تھا۔ وہ تو اُسے ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتے تھے یہ سب کیونکر بتاتے؟

پراپرٹی سیل ہوئی تھی تو اُسے گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ مگر ۔۔۔ پاپا ختم ہوئے تو اُسے سدھ بدھ نہ رہی۔ کل کچھ کچھ ہوش آیا، کیا کھویا کیا پایا ذہن پر زور دینے لگی ۔۔۔ تو معلوم ہوا ۔۔۔ پاؤں تلے کی زمین تک سرکا دی گئی ہے، سر پر چھت تک نہیں۔ گھر ہی نہیں۔

"نور خان نے میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔ سوائے اس کوٹھی کے"۔ اُس کے کانوں میں پاپا کے آخری الفاظ گونجے۔

اور اب ۔۔۔ کوٹھی بھی چھین لی ہے پاپا۔ گھٹنوں پر سر رکھ کر وہ بے اختیار رو دی۔

کوٹھی گروی تھی مگر وہ ابھی سے مختارِ کل بن رہا تھا۔ کوٹھی اور اُس کی ہر چیز اپنی تحویل میں لے لی تھی۔ یہ ایک سوچی سمجھی سکیم تھی۔ اُس نے آپ کو اتنا بے بس کر دیا کہ آپ نے اپنی رہی سہی پونجی بھی عجلت میں اُسی کے حوالے کر دی۔ وہ سمجھتا تھا دل کا دورہ آپ کو کوٹھی کسی اور شریف انسان کے پاس گروی رکھوانے کی مہلت نہیں دے گا، یہ آپ اُسے ہی سونپ دیں گے۔ اُس کا منتہا یہی تھا، اُس کا مقصد یہی تھا۔

وہ بلک بلک کر رو دی۔

یہ کوٹھی اب واپس نہیں ملنے والی پاپا۔ یہ گروی نہیں رکھوائی گئی، چھینی گئی ہے آپ سے۔

"روؤ نہیں بیٹی"۔ انکل نے اُس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ ہر اندھیرے کے بعد اُجالا ہوتا ہے، ہر رات کا سویرا ہوتا ہے۔ خُدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں"۔

اور ۔۔۔ سر اوپر اٹھاتے ہوئے اُس نے آنسو پونچھ لئے۔

باہر شام کے سائے ملگجے ہو رہے تھے۔ نیچے جزیرے پر کی بتیاں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ جہاز اپنے منزلِ مقصود کے آس پاس منڈلا رہا تھا۔

مشعل نے رُخ اندر کیا۔ مسافروں میں خاموش سی کھلبلی مچ گئی تھی۔

اُس نے بھی میگزین بند کر کے رکھا۔ ہینڈ بیگ کندھے سے لٹکایا۔

جہاز رَن وے پر رُک گیا۔ باقی مسافروں کے ہمراہ وہ بھی سیڑھیاں اُتر کر آگے بڑھ آئی۔ رن وے پر ہلچل سی مچی تھی۔ سامنے ریلنگ کے پاس ریسیو کرنے والے چہرے متجسس لگ رہےتھے۔ ایئر پورٹ کی مختصر سی بلڈنگ میں زندگی تھی۔ کیفے میں کراکری کی کھنک تھی ــــ اور ــــ دُور پار، آس پاس ہریالی ہی ہریالی۔

اُس نے متجسس چہروں پر نگاہ ڈالی۔ انہی میں یقیناً آنٹی ہونگی، پاپا کی منہ بولی بہن۔ جن کا ذکر وہ اکثر پاپا سے سُنتی آئی تھی ــــ اور جن کی تصویریں وہ بارہا دیکھ چکی تھی۔ موٹے موٹے سے ہونٹ، پھینی سی ناک، بڑی بڑی آنکھوں میں پاؤ پاؤ بھر سُرمہ، بھاری بھرکم جسم، کبھی ماتھے پر بل ڈالے غصّے میں گھورتی ہوئیں، کبھی باچھیں کھلیں دل کھول کر ہنستی ہوئیں۔

''بہت خاص چیز ہے تمہاری آنٹی''۔ پاپا اکثر کہتے۔ ''سرتاپا خلوص، محبت ــــ ہاں البتہ [illegible]ناک پر دھرا رہتا ہے مگر اس طرح کہ دیکھتے ہی بے اختیار قہقہہ لگانے کو جی چاہے۔ یوں [illegible]بڑھ کر بولے گی جیسے اِس سے بہادر کون ہوگا مگر بلی نے میاؤں بھی کیا تو جھٹ پلنگ کے

نیچے گھُس جائے گی۔ ''میں بھی ہاجرہ سہراج ہوں''۔ سراج کی بجائے ہمیشہ ''سہراج'' کہے گی...''

مگر ــــ وہ خیالوں سے چونکی ــــ کئی خواتین تھیں وہاں، پر وہ صورت کہیں نظر نہیں آ رہی تھی جس کی اُسے تلاش تھی۔

وہ آگے بڑھ آئی۔ مسافروں کی لاؤنج کی طرف۔

ضروری کارروائیوں سے فارغ ہو کر ــــ اپنا سوٹ کیس ہاتھ میں تھامے وہ باہر آئی۔ تو شام اپنے سائے پھیلا چکی تھی۔ ایئر پورٹ کی جگمگ جگمگ کرتی روشنیوں میں کھڑی وہ پریشان سی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ آنٹی کی صورت کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اب کیا ہوگا؟ اُس نے گھبرا کر سوچا۔

ایڈریس تو تھا اُن کا اُس کے پاس۔ وہ یہاں سے تقریباً گھنٹہ بھر کے فاصلے پر واقع ایک اور چھوٹے سے جزیرے میں رہتی تھیں۔ مگر ــــ اندھیرا تھا، سفر کشتی کا ــــ اور وہ تنہا ــــ پلٹ کر وہ استقبالیہ کی طرف بڑھنے لگی۔

''آپ ــــ مِس ذوالفقار علی؟''۔

بھاری سی آواز، دھیمے سے لہجے پر ــــ چونک کر وہ رُکی۔

لمبا قد، چوڑے شانے، پُرکشش نقوش۔ چونتیس پینتیس سال کا ایک آدمی قدم بھر کے فاصلے پر کھڑا اُس سے پوچھ رہا تھا۔

اُس کی آواز دھیمی تھی اس کے باوجود رعب لئے تھی۔ سرخی مائل نسواری آنکھوں میں نرمی تھی مگر اختیار لئے تھیں۔ انداز میں شائستگی تھی پر جاہ وحشم لئے تھا۔

اُس نے سفید بے داغ پتلون قمیض اور سفید ہی شوز پہن رکھے تھے۔ قیمتی لباس کے خوبصورت تراش سے پتہ چلتا تھا اُسے اپنی مردانہ وجاہت کا بخوبی احساس تھا۔

اُس کی نظروں میں اختیار کے ساتھ تجسس سا تھا، تعلق سا تھا، سوچ سی تھی۔

"ہ۔۔۔ہاں"۔ وہ کچھ بدحواس سی ہوگئی۔

اُس کی نظروں کی اتھارٹی سے، آواز کی کمانڈ سے یا پھر انداز کے جاہ وجلال سے۔

وہ اتنا لمبا چوڑا، اتنا بڑا بھی تو تھا۔ اُس کی عمر کا دُگنا تقریباً۔

پل بھر کو آدمی کی نظروں میں دلچسپی کا عنصر اُبھرا۔۔۔ پرکشش لب مبہم سے تبسم پر غالب آئے۔

"مجھے مسز سراج نے آپ کو لینے بھیجا ہے"۔ وہ سنجیدگی سے بولا۔

"اوہ۔ اچھا ہوا آپ..." اپنے مخصوص فری فرینک انداز میں مزید کچھ بولنے سے قبل ہی اُس نے بات روک لی۔

وہ تو کچھ زیادہ ہی بوس بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ مسکراہٹ کو ہونٹوں پر آنے سے قبل ہی روک لیا تھا۔ اور۔۔۔ بات اس قدر سنجیدگی سے کر رہا تھا گویا مسکرا دے گا یا کُھل کر بات کرے گا تو جرمانہ کر دیا جائے گا۔

"چلئے"۔ وہ مزید تدبّر سے بولا۔

"چلئے"۔ کندھے اچکاتے ہوئے مشعل نے اپنا سوٹ کیس اس کی طرف بڑھایا۔

ایک لمحے کو وہ تذبذب میں پڑ گیا۔

پھر۔۔۔ جا ، کیوں ایک بار پھر اُس کے لب متبسم ہوتے ہوتے رہ گئے۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے سوٹ کیس اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

وہیں کھڑے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جیسے کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ مگر اُسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ قریبی کھمبے کے پاس سے ایک باوردی آدمی لپک کر آیا اور سوٹ کیس اُس کے ہاتھ سے لے لیا۔

خاصی اونچی چیز تھا۔ وہ ہونٹ سکیڑے اُسے دیکھ رہی تھی۔

"آیئے"۔ ایک بار پھر وہ بولا۔

اور۔۔۔ اُسے ساتھ لئے ایئرپورٹ کی حدود سے باہر نکل آیا۔

شام گہری ہو چلی تھی۔ لمبی لمبی گھاس نم تھی۔ چاند کی دودھیا روشنی ہر سُو پھیل رہی تھی۔

سرخ اینٹوں سے بنے راستے کے دونوں طرف کھمبوں پر لگے لیمپ روشن تھے۔

وہ اُس کے قدموں سے قدم ملائے چلا جا رہا تھا۔

مشعل نے مڑ کر دیکھا۔ وہی باوردی آدمی اُس کا سوٹ کیس لئے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

جلد ہی وہ لوگ ساحل پر آ گئے۔

"آیئے"۔ وہ اُسے قریب کھڑی بوٹ میں لے آیا۔

ملازم بھی معہ سوٹ کیس کے پہنچ گیا۔

مشعل کو ساتھ لئے وہ دو چار سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کیبن میں آ گیا۔

"آپ آرام کریں۔۔۔ پلیز"۔ اُس نے آرام دہ سیٹوں کی طرف اشارہ کیا۔

اور خود۔۔۔ نپے تلے قدم اُٹھاتا باہر چل دیا۔

مشعل نے ایک سرسری نظر کیبن پر ڈالی۔ چند سیٹس، کونے میں لگی میز، اُس پر گلدان میں سجے تازہ مہکتے پھول، ایش ٹرے، اور چھوٹی سی ٹرے میں رکھا خوبصورت تھرمس اور گلاس۔

وہ کھلی کھڑکی کے قریب آئی۔ جزیرے پر کی بتیاں اندھیرے میں تیرتے جگنوؤں کی طرح جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ آس پاس، دُور پار۔۔۔ پانی ہی پانی تھا، تاریک، سیاہ۔۔۔ ہاں خود کشتی کی بتیاں ضرور منعکس ہو رہی تھیں اُس میں۔

کشتی سٹارٹ ہوئی تو اُس کی محویت ٹوٹی۔

اُس نے شیشوں میں سے دیکھا۔ کیپٹن بڑے سے وہیل کو گھما رہا تھا۔ جبکہ قدرے فاصلے

پر ریلنگ تھامے کھڑا وہی آدمی سیاہ پانیوں پر نظر جمائے تھا۔

مڑ کر وہ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ہنوز کندھے سے لٹکا ہینڈ بیگ اتار کر پاس ہی رکھ لیا۔ سر پشت سے ٹکایا ہی تھا کہ۔

وہی باوردی ملازم جو تھوڑی دیر قبل اُس کا سُوٹ کیس لایا تھا، ٹرے میں جوس کے گلاس لئے اندر آ گیا۔ مؤدب طریق سے ٹرے کونے والی میز پر رکھ کر وہ واپس چل دیا۔

اُسے تیز بھوک لگی تھی، جوس کی بھی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ اور ایسی حالت میں وہ کبھی تاخیر نہیں کرتی تھی۔ اٹھ کر جوس کے قریب آ گئی۔

''ہہہ۔ ایپل جوس''۔ وہ بڑبڑائی۔ ''جیسا خود ویسا ہی ٹیسٹ۔ کیا مینگو جوس نہیں تھا، لیمن یا کوئی بھی کھٹا میٹھا...''

وہ واپس مُڑی۔ ٹانگیں سیدھی پھیلاتے ہوئے بے نیازی سے سیٹ پر پڑ رہی۔

وہ سخت تھکی ہوئی تھی۔ بہت بھوک لگ رہی تھی ___ مگر ___ برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ کہ ___

گھوم پھر کر اُس کی سوچ اس آدمی پر آ ٹکی۔ کتنا سوبر تھا۔ سنجیدہ ___ اور ___ جانے کیوں وہ بے اختیار ہنس دی۔ وہ تو ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ بھی روک لیتا تھا۔ اس قدر سختی سے جڑے ہوئے جبڑوں میں درد تو ضرور ہوتا ہوگا۔

معاً بھاری قدموں کی آہٹ پر وہ چونکی۔ وہی تھا شاید ___ کیبن میں آ رہا تھا۔

وہ سُستی سے اٹھتے ہوئے سیدھی ہو بیٹھی۔

وہ اندر آیا، سیدھا میز کی طرف گیا۔

''آپ نے جوس نہیں پیا''۔ وہ گلاسوں پر نظریں جمائے پوچھنے لگا۔

وہی سنجیدگی، وہی تدبّر ___ جانے کیوں وہ چڑ سی گئی۔

''اچھا نہیں لگتا''۔ وہ مختصراً بولی۔

''اوہ''۔ وہ اپنا گلاس اٹھا کر سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ''کوفی پئیں گی آپ''۔ اُس نے گلاس منہ سے لگا لیا۔

اور ___ مشعل جل ہی تو گئی۔ ایپل جوس کے بعد کافی ___ کیا آئس کریم نہیں پوچھ سکتا تھا۔

''نہیں''۔

''پھر؟''۔ وہ اب بھی سنجیدہ تھا۔

مشعل نے اس کے گلاس کی طرف دیکھا۔ تقریباً خالی تھا۔

کس مزے سے پی رہا تھا، جیسے مہمان مشعل نہیں وہ تھا۔

کڑھتے ہوئے اُس نے رُخ کھڑکی کی طرف کر لیا۔

وہ اٹھا، خالی گلاس میز پر رکھا اور ___ دوبارہ اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔

ایک اچٹتی نظر مشعل پر ڈالی۔ کچھ جھنجھلائی جھنجلائی سی، روٹھی روٹھی سی وہ باہر جھانک رہی تھی۔

جانے کہاں سے ___ بھٹک کر ایک بار پھر لحہ بھر کو اُس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

وہ بہت بڑے باپ کی اکلوتی بیٹی تھی ___ کم سن تھی اور یہاں شاید ___ حسب مرضی برتاؤ نہیں پا رہی تھی۔

''کیا پسند کریں گی آپ''۔ اُس نے نرمی سے پوچھا۔

اُس نے جلدی سے رُخ اس کی طرف کر لیا۔ لمبی لمبی سیاہ خمیدہ پلکوں میں بادامی شکل کی بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

اُسے اچانک خیال آیا، اس کی خوبصورت نیلی آنکھیں ___ اُس کے نام کی طرح روشن

چمکیلی تابناک لو لئے تھیں۔

''آئس کریم''۔ وہ معصومیت سے بول اٹھی۔

وہی مبہم ___ مسحور کن مسکراہٹ اُس کے پرکشش ہونٹوں کو ایک بار پھر چھو گئی۔ وہ تو اُس کے اندازے سے بھی زیادہ چھوٹی تھی۔

''ایم سوری۔ آئس کریم نہیں ہوگی''۔ آئس کریم وہ بہت کم کھاتا تھا۔ ''چوکلیٹ کھا...''۔

''ہاں ہاں''۔ وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے بولی۔

محظوظ سا ہوتے ہوئے وہ اٹھا اور باہر چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں ملازم اُس کے لئے چوکلیٹ کے دو پیکٹ لے آیا۔

سیٹ پر نیم دراز، مزے لے لے کر وہ کھا رہی تھی ___ پھر ___ شاید غنودگی نے آلیا۔

''میڈم۔ صاحب ڈنر پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں''۔ ملازم نے آ کر اُسے اطلاع دی۔

اور ___ خمار آلود آنکھیں ملتی وہ ملازم کی ہمراہی میں نیچے مختصر سی کیفے میں آ گئی۔

کونے میں لگی میز پر بیٹھا وہ اسی کا منتظر تھا۔ بغور اُسے اندر آتے دیکھ رہا تھا۔

سبز چیک کاٹن کی ڈھیلی ڈھالی کالر کف والی قمیص، شلوار۔ سیاہ گھنے بوائے کٹ بال۔

اپنی بے پناہ خوبصورتی سے بیگانہ ___ وہ لڑکی کم لڑکا زیادہ تھی۔

اس کی ہر حرکت، ہر انداز سے لاڈلا پن، لا اُبالی پن ٹپکتا تھا۔ جس کی ہر خواہش پوری کی جاتی ہو، جس پر کوئی روک ٹوک نہ کی جاتی ہو۔ مگر ___

اُسے دُکھ ہوا۔ اس عمر میں اس پر کتنی قیامت ٹوٹی تھی۔ چاہنے والا باپ بچھڑ گیا تھا ___ اور ___ گھر سے بے گھر ہوئی تھی۔

''بیٹھئے ___ پلیز''۔ اُس نے اپنے مقابل کی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ملازم نے اُس کے لئے کرسی پیچھے کھسکائی۔ اور وہ بیٹھ گئی۔

''آپ ___ کھانے میں کیا پسند کریں گی؟'' اس کا لہجہ پہلے کی نسبت دوستانہ اور خوشگوار تھا۔ شاید اُسے احساس ہو گیا تھا کہ اتنی چھوٹی سی معصوم سی چیز اُس کی گھمبیر سنجیدگی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

جبھی تو شروع میں بدحواس سی اور بعد میں تنگ آ کر جھنجلائی سی رہی تھی۔

اور پھر اُس نے اُس کی پسند پوچھنا اس لئے بھی ضروری سمجھا۔

کہ اُسے یقین تھا وہ اُس کی پسند کا کھانا بھی رد کر دے گی۔

''برگر''۔ وہ فوراً بولی ___ مگر پھر ___ اُس کی صرف بغور تکتی نظریں دیکھ کر اُسے شبہ گزرا ___ یہاں برگر بھی نہیں تھا۔ ''آپ ___ آپ کیا کھائیں گے؟''

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

مشعل چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ وہ کچھ کچھ انسان ضرور تھا۔ مسکرانا جانتا تھا پر...

''کیک پیس اور بلیک کوفی''۔

''یہ تو میرے پاپا لیا کرتے تھے''۔

اوہ وہ ___ مزید مسکرا دیا۔ اُس کی معصومیت اُسے اچھی لگی۔

''میں بھی لیا کرتا ہوں''۔

''مگر ___ میں تو ___ نہیں لے سکتی''۔ وہ متفکر سی ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''آپ کے لئے برگر آ جاتے ہیں''۔ وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔

اور ___ مشعل کے جان میں جان آ گئی۔

دونوں خاموشی سے ڈنر میں مصروف تھے۔ وہ کیک کا ایک پیس کھانے کے بعد گھونٹ گھونٹ کر کے کوفی پی رہا تھا۔ کبھی کبھار ایک نظر اپنے مقابل بیٹھی ہوئی مشعل کی طرف اٹھ جاتی۔ اردگرد سے بے نیاز وہ بڑے مزے سے برگر کھانے میں مصروف تھی۔ ساس ڈال ڈال کر

کھائے جا رہی تھی۔ معاً جانے کیا ہوا؟ کانٹا لڑھک کر اُس کی گود میں گرا۔۔۔ اور ساتھ ہی ڈھیر سارا ساس اُس کی قمیض پر پھیل گیا۔

ذرا اثر لیے بغیر۔ اُس نے ایک نظر اپنی قمیض پر ڈالی۔

اور پھر۔۔۔ اطمینان سے کھانے میں مصروف ہو گئی۔

جانے کیوں؟ اُسے اُس پر ترس سا آیا۔ دیکھنے میں وہ سولہ سترہ سال کی تھی۔ کہ جہاں عام طور پر لڑکیاں سیانی ہو جاتی ہیں، اپنی صنف کا احساس ہونے لگتا ہے اور ۔۔۔ گرد و پیش سے باخبر رہنے لگتی ہیں۔

ایک یہ تھی۔ جسے بے شمار دولت اور لاڈ پیار نے معصوم بچی ہی بنائے رکھا تھا۔

بلکہ۔۔۔ ایسا۔۔۔ شاید نہیں تھا۔ آج کل کی دولت مند اور موڈرن لڑکیاں تو اس عمر میں خاصی جہاندیدہ، تیز طرار ہوتی ہیں۔

اور کچھ نہ سہی۔

یہ تو احساس ہوتا ہی ہے کہ اُن کے مقابل کوئی جوان شخص موجود ہے۔ اُنہیں اُس کی موجودگی میں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں یہ وہ بخوبی جانتی ہیں۔۔۔ اور یہ ۔۔۔

یہ شاید اِس جھنجھٹ میں ہی نہیں پڑی تھی کبھی۔ سوچا ہی نہیں تھا جیسے اِس پہلو پر بھی۔ اسے تو ۔۔۔ مختصر سی مسکراہٹ پھر اُس کے لبوں کو چھو گئی ۔۔۔ بس آئس کریم چاہیے تھی یا پھر برگر۔

''یہ نیپکن لیجیے''۔ اُس نے نیپکن اُس کی طرف بڑھایا۔

مشعل نے ایک نظر اُسے ۔۔۔ پھر نیپکن کی طرف دیکھا۔ بادلِ نخواستہ نیپکن اُس سے ۔۔۔ لے کر بے دلی سے قمیض پر پھیرا اور واپس پلیٹ میں رکھتے ہوئے کھانے میں مصروف ہو گئی۔

اُس نے ایک تھکی سی سانس لی ۔۔۔ اور کوفی کی گھونٹ حلق سے اتارنے لگا۔

مشعل نے کھانا ختم کر لیا۔ نیپکن سے ہاتھ پونچھ لیئے۔

اُس نے دیکھا۔ وہ ایک برگر بھی پورا نہ کھا پائی تھی۔ شوق بہت تھا البتہ کھانے کا۔

''میں اوپر جاؤں گی''۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

کوئی جواب دیئے بنا وہ خاموشی سے کوفی پیتا رہا۔

''وہ ۔۔۔ وہ...'' وہ جیسے کچھ کہنا چاہتی تھی۔

مگر ۔۔۔ کپ پر نظریں جمائے جانے وہ کن سوچوں میں گم تھا۔

''باہر ۔۔۔ اندھیرا ۔۔۔ بہت...'' وہ کبھی باہر اور کبھی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بے بسی کہہ رہی تھی۔

مگر ۔۔۔ وہ اب بھی چپ چاپ کوفی پر نظریں جمائے تھا۔

''میں ۔۔۔ کیسے ۔۔۔ وہ اندھیرا...'' وہ جیسے روہانسی ہونے لگی تھی۔

پر ۔۔۔ اُس نے اب بھی نظریں نہیں اٹھائیں۔

اور ۔۔۔ گھوم کر وہ اُس کے پاس آ گئی۔

''اے مسٹر''۔ وہ زور سے بولی۔

اُس نے اطمینان سے کپ میز پر رکھا۔ نشیلی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔

''کیا بات ہے''۔ وہ آرام سے پوچھنے لگا۔

پل بھر کو تو مشعل سٹپٹا سی گئی۔

شروع میں اس کا دھیان نہ رہا ہو ممکن ہے۔ مگر ۔۔۔ اُس کے آخری جملے وہ ضرور سن پایا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک، مطمئن انداز بتا رہے تھے۔

اُس نے رُخ دوسری طرف کر لیا۔

''مجھے باہر ڈر لگتا ہے''۔ اس کے باوجود اُس کی آواز میں دھونس تھی۔

اس کی گھنی بھوئیں اوپر اٹھ گئیں۔ پرکشش لب مسکرا دیئے۔

پھر ۔۔۔ کرسی پیچھے کھسکائی ۔۔۔ اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو"۔ اُس نے 'چلیئے' اس لئے نہیں کہا کہ یہ تخاطب اُس کے لئے بہت وزنی لگنے لگے۔ "میں چھوڑ آتا ہوں تمہیں"۔

اور وہ ۔۔۔ اُسے اوپر کیبن تک لے آیا۔

خود واپس کیفے میں آکر کرسیاں ملا کر اُن پر لیٹ رہا۔ وہ چاہتا تو اوپر کیبن میں مشعل کے پاس بھی جا سکتا تھا۔ مگر اُس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اُس کی مہمان تھی، ایک معزز امانت تھی، شاید اس لئے۔

بوٹ کنارے پر آ لگی تھی۔ وہ مشعل کو ساتھ لئے اتر آیا۔

مسز سراج کا گھر یہاں سے قریب ہی تھا۔ وہ لوگ پیدل چل پڑے۔ پیچھے پیچھے وہی باوردی ملازم اُس کا سوٹ کیس لئے چلا آ رہا تھا۔

قدرے ڈھلان چڑھ کر ۔۔۔ آگے زمین ہموار تھی۔ راستہ کچا تھا، دونوں طرف گھنے قد آور درخت تھے۔ قدموں کے نیچے خشک گھاس اور درختوں سے گرے سوکھے پتے چُرمرا رہے تھے۔ دائیں طرف ایک کھمبے کے لیمپ کی مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔

اچانک مشعل کو احساس ہوا وہ اُس سے کافی دُور نکل گیا تھا۔ اُس نے اپنے اردگرد دیکھا اور ماحول کے سناٹے سے گھبرا کر قدم تیز کر لیئے۔ اُس سے چند قدم پر ہی تھی کہ وہ مڑا ۔۔۔ اور واپس اُس کی طرف آنے لگا۔

"میں شاید تیز چل رہا ہوں"۔ پاس پہنچ کر اُس نے کہا۔

"جی نہیں"۔ وہ کچھ جل کر بولی۔

وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

مگر ۔۔۔ ایک بار پھر ۔۔۔ اُس سے آگے نکل گیا۔

دائیں بائیں ۔۔۔ دُور پار ۔۔۔ درخت سی درخت، جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں، سائیں سائیں کرتے دیو قامت درخت۔ خاموشی تھی، دُور دُور تک، ہر طرف، ہر سُو۔

اُس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

گھپ اندھیرے میں۔ آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھتا۔ سفید یونیفارم میں ملبوس ملازم ۔۔۔ اُسے ڈراؤنی فلم کا روح معلوم ہوا۔

اور ۔۔۔ وہ پوری قوت سے بھاگی۔

"کیا ہوا؟" اُس کے بھاگنے کی آہٹ پر وہ مڑ کر وہیں رُک گیا۔

"کچھ نہیں"۔ وہ پھولی سانسوں کے درمیان بولی۔

اُس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ سائیں سائیں کرتا سنسان تاریک ماحول۔ اُسے گھبرا دینے کو کافی تھا۔

"کسی HORROR MOVIE کا سین تو یاد نہیں آ گیا"۔

اس بھوتوں کے بسیرے جیسے ماحول میں اُس کی آواز بڑی پُر اسرار تھی۔

"چُپ"۔ ایک دبی سی چیخ کے ساتھ اُس نے بے اختیار اُس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

ایک پل کو وہ ۔۔۔ گڑبڑا سا گیا۔

پھر دُوسرے ہی لمحے ۔۔۔ بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"آؤ چلیں"۔ اُس نے آہستہ سے اس کا ہاتھ ہٹایا۔

اب وہ اُس کے بالکل ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ جیسے ذرا بھی الگ ہوئی تو کوئی آن دبوچ لے

اُس نے جلد ہی محسوس کیا مشعل کے قدم اس کے مقابلے میں کہیں چھوٹے تھے۔

"تیز تیز چلو"۔ اُسے کہنا ہی پڑا۔

وہ وہیں رُک گئی۔ اُس کے لہجے کا تحکم اُسے اچھا نہ لگا۔

"آپ آہستہ چلیں"۔ وہ اب بھی کھڑی تھی۔

"اوہ ___ اچھا ___ چلو"۔

اور پھر ___ اُسے آہستہ آہستہ اُس کا ساتھ دینا ہی پڑا۔

دستک کی آواز پر ہاجرہ آنٹی باہر نکلیں۔ وہی نقوش، وہی صورت، وہی پچاس کے لگ بھگ عمر، بھاری جسم۔ جو وہ اُن کی تصویر میں دیکھ چکی تھی۔

انہوں نے آگے بڑھ کر اُسے گلے لگایا۔ تو وہ بے اختیار رو دی۔

پاپا کی سگی بہن نہ سہی ___ وہ انہیں بہن سے کم کبھی نہ مانتے تھے۔ اور پھر اب ___ وہ ہی تو سب کچھ تھیں اُس کی۔ آنٹی بھی آنسو روکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

جانے کیوں؟ وہ بھی اداس ہو گیا تھا۔ دلنشین آنکھیں گھائل سی لگ رہی تھیں۔ شاہانہ شخصیت مجروح سی ہو رہی تھی۔

"آنٹی میں اب اجازت چاہوں گا"۔ وہ بھاری سی آواز میں بولا۔

"ارے ___ نہیں بیٹا۔ آؤ اندر آؤ ___ چائے تو پی کر جاؤ"۔ وہ آنسو پونچھتے ہوئے عجلت سے بولیں۔

مشعل نے اُن سے لپٹے لپٹے اُس کی طرف دیکھا۔

اس کی بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں، چکنے گال بھیگ گئے تھے ___ اور ___ وقفے وقفے سے اب بھی ہچکیاں لے رہی تھی۔

وہ اور بھی اداس ہو گیا۔ آنکھیں مزید گھائل نظر آنے لگیں۔ شاہانہ شخصیت کی مجروحیت سوا ہو گئی۔

"پھر کبھی سہی آنٹی"۔ اُس کی آواز بھی اُداس تھی۔ "اس وقت بہت تھک گیا ہوں"۔

"اچھا بیٹے جیسے تمہاری مرضی"۔

مشعل نے دیکھا۔ سامنے ہی ایک سیاہ قیمتی گاڑی اُس کی منتظر تھی۔ مؤدب باوردی ڈرائیور اُسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر کار کا پچھلا دروازہ تھام کر کھڑا ہو گیا تھا۔

باوقار انداز میں چلتا وہ گاڑی میں بیٹھا۔ گاڑی چل پڑی۔

تو آنٹی اُسے اندر لے آئیں۔

صبح اُس کی آنکھ کھلی ۔۔۔ تو دن خاصا نکل آیا تھا۔

اٹھ کر ۔۔۔ وہ نہائی، کپڑے بدلے تیار ہوئی۔ اور پھر گھر میں اِدھر اُدھر گھومنے لگی۔

آنٹی کا چھوٹا سا گھر تھا۔ دو چھوٹے چھوٹے کمرے، ایک غسلخانہ، چھوٹا سا برآمدہ جسے جالی لگا کر بند کروا کر کے لاؤنج کا کام لیا جاتا تھا، وہیں لاؤنج کے دائیں سرے پر چھوٹا سا باورچی خانہ تھا جس کا ایک دروازہ لاؤنج میں اور دوسرا باہر کی طرف کھلتا تھا۔ لاؤنج میں کچن کے دروازے کے قریب ہی انہوں نے چھوٹی سی میز اور دو کرسیاں لگا رکھی تھیں، اسے وہ کھانے کی میز کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔ وہیں ایک طرف تخت اور اُس پر گاؤ تکیے رکھے تھے۔

دو کمروں میں سے ایک آنٹی کا اور دوسرا انہوں نے مشعل کے لئے ٹھیک کیا تھا۔ اچھے سے بستر کے علاوہ ایک میز اور کرسی بھی کھڑکی کے قریب لگوا دی تھی۔ میز پر گلدان میں موسم کے تازہ پھول بھی سجا رکھے تھے۔ اسی کمرے کا ایک دروازہ غسلخانے میں کھلتا تھا جسے اب ۔۔۔ وہ اور آنٹی دونوں استعمال کرتی تھیں۔

آنٹی کا گھر چھوٹا تھا مگر سلیقے سے سجا تھا۔ وہ باہر آ گئی۔ یہاں کوئی چار دیواری، کوئی باڑ نہیں تھی۔ بس سبزہ تھا، ہریالی تھی۔ اونچے اونچے پام کے درخت تھے، نوخیز گھنی جھاڑیاں تھیں۔ پھر کچھ فاصلے پر چھوٹے موٹے مکانات کا سلسلہ تھا۔

وہ گھوم۔ پچھواڑے آ گئی۔ مرغیوں کی "کٹ کٹ" پر وہ چونکی۔

دیکھا۔ لوہے کی تار کی جالیوں میں بند بے شمار مرغیاں تھیں۔

وہ لپک کر پاس چلی آئی۔ سفید سفید مرغیاں، کچھ بیٹھیں، کچھ چلتی پھرتیں، کچھ کھاتی چگتیں، کچھ لڑتی جھگڑتیں۔

اُسے بہت اچھا لگا۔ خوش خوش وہ سب دیکھ رہی تھی۔

معاً اُس نے دیکھا۔ وہیں جالی میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی سے آنٹی برآمد ہوئی تھیں۔ اُن کے ہاتھوں میں ٹوکری تھی اور اُس میں ان گنت انڈے۔

خوشی کے مارے وہ اچھل پڑی۔ یہ تو شاید ۔۔۔ آنٹی کا ہی پولٹری فارم تھا۔

"آنٹی مجھے آپ کی جگہ بہت پسند آئی"۔ وہ سرشاری آنٹی کے ساتھ اندر کی طرف بڑھی۔

"اے بیٹا ۔۔۔ رات تک جو 'آنٹی'، کہا سو کہا بوجھ اٹھا لیا۔ اب آگے سے 'پھپھو' کہنا سیدھا سیدھا۔ زہر لگتا ہے مجھے یہ غیر لفظ ہاں ..."۔

اور اُس سے پھپھو اُسے بہت اچھی لگیں، بالکل اپنی۔

"پھپھو مجھے یہ سب بہت اچھا لگ رہا ہے"۔ اُس نے دوبارہ کہا۔

"اچھا ہوا بیٹے ورنہ مجھے تو فکر ہی لگی تھی کہ یہاں آ کر تم پریشان نہ ہو جاؤ۔ چھوٹی سی جگہ ہے۔ شہروں کی طرح رونق تو ہے نہیں۔ تھوڑی سی آبادی ہے۔ گنے چنے مکان ہیں۔ یا پھر باغات ..." وہ شفقت سے کہتی جا رہی تھیں۔

وہ کچن میں گئیں۔ انڈے ایک طرف رکھے۔ اور جلدی جلدی اُس کے لئے ناشتہ بنانے لگیں۔

وہ بھی پاس ہی کھڑی دلچسپی سے انہیں کام کرتے دیکھ رہی تھی۔

"پھپھو میں بھی آپ کے ساتھ کام کروں گی"۔ اُسے یہ چھوٹا سا کچن ۔۔۔ اور پھپھو کا خود کام کرنا بہت اچھا لگا۔

''نا بیٹانا۔۔۔ میں تمہیں کام کرنے نہیں دوں گی۔ نازوں سے پالا ہے میرے بھائی نے...''۔

''آپ بھی تو پاپا کی بہن ہیں خود کام کرتی ہیں...''۔

''میری بات اور ہے...''۔

''کیسے اور ہے۔ میں پاپا کی بیٹی آپ بہن ہیں ایک جیسی تو ہیں''۔

اس کی بھولی باتوں پر وہ شفقت سے مسکرادیں۔

''اچھا آؤ ناشتہ کرلیں''۔

''آپ نے بھی نہیں کیا''۔

''میں نے ایک کپ چائے پی ہے ناشتہ تو تمہارے ساتھ کرنا تھا''۔ وہ لاؤنج میں کھلتے دروازے کی طرف بڑھیں۔

وہیں میز پر انہوں نے ناشتہ لگایا۔ دونوں بیٹھ کر کھانے لگیں۔

مشعل کو چھوٹے پیمانے پر یہ سب کچھ بہت پرکشش لگ رہا تھا۔ چھوٹے سے کچن میں خود اپنے ہاتھوں سے منٹوں میں ناشتہ تیار کرو اور خود ہی میز پر لگا کر وہیں بیٹھ جاؤ۔

''بیگم صاب!''۔

مشعل نے اجنبی سی آواز پر مڑ کر دیکھا۔

دروازے میں ایک اٹھارہ بیس سال کا لڑکا کھڑا تھا۔ چہرے کے نقوش اور رنگ سے وہیں جزیرے کا باشندہ لگتا تھا۔ ملازم تھا شاید پھپھو کا۔

''کیا بات ہے عبداللہ''۔ پھپھو نے پوچھا۔

''میں جا رہا ہوں اگر کوئی کام ہو تو بتا دیں''۔ اُس کا لہجہ بھی اجنبی تھا۔

''کام تو کوئی نہیں۔ ہاں وہ ایوب صاحب کے یہاں سے انڈوں کے پیسے لیتے آنا ابھی

تک نہیں دیئے۔ اور وہ ۔۔۔ ہوٹل والے کو بھی یاد دلانا''۔

''اچھا بیگم صاب''۔ وہ جانے لگا۔

''اے سن تو''۔ پھپھو کو جیسے یاد آگیا۔ ''وین کی جو مرمت کروائی تھی اُس کی رسید دی مالک کو؟''

''جی ہاں کل ہی دے دی تھی''۔

''اچھا جا پھر''۔

اور وہ چل دیا۔

مشعل دلچسپی سے تمام گفتگو سن رہی تھی۔

''پھپھو۔ آپ تو بڑا کام کرتی ہیں''۔

''ہاں بیٹا۔ کرنا پڑتا ہے''۔ وہ دکھی سی ہوگئیں۔ ''تمہارے پھوپھا زندہ تھے تو مجھے کوئی مشکل نہیں تھی۔ منیجر تھے یہاں کے۔ پر اب تو دو سال سے میں ہی کر رہی ہوں سب...''۔

مشعل بھی اداس ہوگئی۔

''آپ دکھی نہ ہوں پھپھو''۔ اُس نے تسلی دینا چاہی۔ ''اور پھر اب میں بھی تو آگئی ہوں۔ مل کر کریں گے دونوں''۔

''اے تم کاہے کو کرو گی''۔ پھپھو کو اس کی کام کرنے والی بات اچھی نہ لگی۔ ''یہ عبداللہ مسٹنڈا مفت میں روٹیاں توڑے گا کیا۔ کام ہی کے لئے تو رکھا ہے۔ کر ہی لیتا ہے کچھ۔ اچھا ہے بچارا''۔

اور ۔۔۔ مشعل کو ان کا عبداللہ پر بیک وقت غصہ اور ہمدردی دونوں بہت اچھا لگا۔

''پھپھو آپ کا تو کافی خرچہ بھی ہوتا ہوگا اس کام پر''۔

''آں ۔۔۔ نہیں بیٹا۔ دراصل یہ گھر، وین وغیرہ سب ہمارے مالک کے دیئے ہوئے

ہیں۔ بڑا اچھا انسان ہے۔ تمہارے پھوپھا فوت ہوئے تو اس نے بڑا سہارا دیا۔ یہ چھوٹا سا گھو
خانہ لگوا کر دیا۔ میں تو بس خیال رکھتی ہوں اس کا۔ دراصل میرا کام اس سے حاصل شدہ انڈے
اور مرغیاں جزیرے کے ملازمین وغیرہ کو فراہم کرنا ہے۔ اس سے پہلے یہ سب بڑے جزیرے
سے جا کر لانا پڑتا تھا۔ اب انہیں کافی آرام ہو گیا ہے...."۔

"اس کام کے لئے آپ کو مالک..."۔

"ہاں۔ مجھے ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ اس کے علاوہ مرغیوں کی خوراک دیکھ بھال پر جو بھی
خرچہ ہوتا ہے مالک دیتا ہے۔ ساتھ ہی وین کا پٹرول مرمت وغیرہ سب وہی کرتا ہے۔ وقت
اچھا گزر جاتا ہے"۔

مشعل دلچسپی سے سب سن رہی تھی۔

"پھپھو آپ کو وطن بھی تو یاد آتا ہوگا"۔ اُس نے اچانک پٹڑی بدلی۔

"ہاں۔ پر اب تو عادت سی ہو گئی ہے۔ ہاں تنہائی سے ضرور گھبرا جاتی ہوں"۔ وہ خالی
پلیٹ ایک طرف کرتے ہوئے اپنی پیالی میں چائے ڈالنے لگیں۔ "اب تو تم آ گئی ہو تو یہ کیفیت
بھی جاتی رہے گی"۔

"پھپھو مجھے بھی جزیرے کی سیر کرائیں"۔ قدرے توقف کے بعد اس نے اشتیاق سے
کہا۔

"ہاں ہاں ضرور کراؤں گی۔ اس وقت تو تم تھکن دور کرو اپنی۔ شام کو عبداللہ کے ساتھ
چلیں گے۔ گھما لائے گا۔ شام کے وقت جزیرے کی روشنیاں اور سمندر کی سیر بھی اچھی لگتی
ہے"۔

"اوہ پھپھو کتنا مزا آئے گا"۔ وہ بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔

پھپھو نے محسوس کیا۔ وہ بہت بھلی معصوم سی تھی، غرور تکبر نام کو نہیں تھا۔ منکسر المزاج تھی،

جلدی گھل مل جانے والی پیاری سی بچی تھی۔

وہ تمام وقت پھپھو کے ساتھ ساتھ رہی۔ بچوں کی طرح چہکتی رہی۔ معصوم سوالات کرتی
رہی اور ہر جواب پر پھولے نہ سمائی۔

پھپھو نے مرغیوں کو خوراک دی۔ پانی ڈالا۔ صفائی صبح ہی عبداللہ کر چکا تھا۔

فارغ ہو کر انہوں نے کچن کے آگے بنے باغیچے سے سبزی توڑی۔ کھانا پکایا۔

بارہ بجے تک عبداللہ بھی آ گیا۔

پھپھو اور مشعل نے کھانا کھایا۔ پھر دونوں اپنے اپنے کمروں میں آرام کرنے لگیں۔

پھپھو بھی آج عرصہ بعد خوش لگ رہی تھیں۔ اُنہیں سالوں پہلے کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔
وہ پندرہ سولہ سال کی تھیں، چار پانچ جماعت بھی پڑھے تھے۔ شہر کی کچی آبادی میں نالے کے
کنارے ایک بوسیدہ سے مکان میں اپنے غریب ماں باپ کے ساتھ رہتی تھیں۔ کوئی بہن بھائی
نہ تھا۔ ایک رات اچانک برسات میں اُن کا مکان ٹوٹ پھوٹ کر بہہ گیا۔ ماں باپ بھی سیلاب
کی نظر ہو گئے۔ وہ اکیلی ہی بچ گئیں۔ جوان تھیں، کئی غلیظ نظروں کا شکار ہو رہی تھیں کہ سیلاب
زدگان کی مدد کے لئے مرتضےٰ علی کے بیٹے ذوالفقار علی وہاں پہنچ گئے۔ تب وہ بیس بائیس کے
ہوں گے۔ انہوں نے اُن کے سر پر دوپٹہ ڈالا ___ اور بہن بنا کر اپنے گاؤں لے آئے۔ مرتضےٰ
علی اور اُن کی بیگم نے اُن کا اپنے بچوں کی طرح خیال رکھا۔ پھر موقعہ دیکھ کر انہوں نے اپنے
گاؤں کے ایک تعلیم یافتہ لڑکے سے ان کا بیاہ کر دیا۔ سراج انہیں لے کر شہر آ گئے۔ پھر کسی طرح
ان کی ملاقات اس جزیرے کے موجودہ مالک کے والد سے ہوئی۔ کچھ عرصہ انہوں نے سراج کو
اپنے لکڑی کے جنگلات کی دیکھ بھال پر مامور رکھا مگر بعد میں ان کی دیانتداری اور ایمانداری
کچھ ایسی بھا گئی کہ یہاں اس جزیرے پر اپنا منیجر بنا کر بھیج دیا۔ وہ دونوں ہنسی خوشی زندگی بسر کر
رہے تھے۔ کمی تھی تو اولاد کی۔ علاج کروایا۔ خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا تو صبر شکر کر کے بیٹھے رہے۔

وقت اچھا بھلا کٹ رہا تھا ــــ کہ اچانک دو سال قبل سراج کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ اب وہ ایک بار پھر اکیلی ہو گئی تھیں۔ اطلاع ملتے ہی ذوالفقار علی انہیں ملنے آئے تھے۔ اب شوہر کے بعد اگر کوئی اُن کا اپنا تھا تو اُن کا منہ بولا بھائی تھا۔ جزیرے کے پہلے مالک بھی چند سال قبل چل بسے تھے۔ اب اُن کا اکلوتا بیٹا نگراں تھا۔

اور پھر اچانک ــــ انہیں خبر ملی۔ ذوالفقار علی بھی گزر گئے تھے۔ اس دن وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھیں۔ اب اُن کا خدا کے سوا اس دنیا میں کوئی نہیں رہا تھا۔

پھر انہیں اطلاع ملی، کہ مشعل آ رہی ہے۔ ان کے بھائی ذوالفقار علی کی واحد نشانی۔ اور یہ کہ اُن کی وصیت کے مطابق اُس کی دیکھ بھال اب اُنہی کے ذمے ہے۔ کتنا بڑا اعزاز تھا اُن کے لئے ــــ کتنا اہم سمجھا تھا انہوں نے انہیں۔

اور پھر ــــ آج ــــ وہ یہاں اُن کے پاس تھی خوش تھی۔ یہی کیا کم تھا!

انہوں نے مطمئن سے انداز میں آنکھیں موند لیں۔

مشعل کمرے سے نکل کر باہر آ گئی۔ چھوٹے سے باغیچے میں لگے بینگن اور بھنڈیوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ دنوں بعد اُس کے معصوم چہرے پر طمانیت تھی۔ گو اُس کو اپنے گھر جیسا ماحول نہ تھا ــــ مگر ــــ جو ماحول تھا۔

وہ بہت اپنا سا تھا، پُرسکوں سا، مطمئن سا۔ پھپھو ــــ وہ تو بہت سویٹ تھیں، محبت کرنے والی، شفقت کرنے والی۔ اپنا خون نہ ہوتے ہوئے بھی اُن میں اسے اپنے پاپا کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ ممی جب وہ چھوٹی سی تھی تو چل بسی تھیں۔ قدرت نے اُسے پھپھو کی صورت میں گارڈین دیا ــــ باپ بھی، ماں بھی۔

شام کو عبداللہ انہیں وین میں لے کر پورا جزیرہ گھما لایا۔

منیجر کا مکان ہوٹیل والے کا مکان، مالک کی کوٹھی کے مالی کا مکان، درزن کا گھر، دو چار دکانداروں کے مکانات، مالک کے مزدوروں کے مکانات۔

چھوٹا معمولی سا ہوٹیل، دو ایک چھوٹی موٹی ضرورت کی اشیاء کی دکانیں، چھوٹی سی مسجد ــــ پھر ــــ

دُور تک پھیلے ناریل اور کیلوں کے خوبصورت باغات۔

باغات اور جزیرے کے آخری سرے پر قدرے اونچائی پر واقع، سمندر کی طرف کھلنے والی جھروکوں اور خوبصورت بالکنیوں والی مالک کی الف لیلوی طرز کی کوٹھی۔

یہ جزیرہ موجودہ مالک کو اپنے مرحوم دادا سے ورثے میں ملا تھا۔ اتفاق سے مالک بھی اکلوتا اور اس کے والد بھی اکلوتے تھے۔ چند سال قبل اپنے والد کے انتقال کے بعد۔ سے وہ اکثر و بیشتر جزیرے کی خبر گیری کرنے یہاں آتا تھا۔

یہاں اس کے ناریل اور کیلوں کے باغات تھے۔ اور جزیرے پر بسنے والے جتنے بھی لوگ تھے سب اُس کے باغات اور اُن سے متعلقہ کاموں کی دیکھ بھال پر متعین تھے۔ ان میں بیشتر یہیں کے باشندے تھے۔ یہ چھوٹا سا ہوٹیل، دو چار دکانیں سب انہی کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بنی تھیں۔ بڑی ضروریات کے لئے بڑے جزیرے پر جانا پڑتا تھا۔ اس مقصد کیلئے کشتیاں موجود تھیں۔

باغات کے اندر بغیر اجازت کے کوئی داخل نہیں ہو سکتا، یہ نہایت اعلیٰ قسم کے کیلے اور بہت عمدہ ناریل ہیں۔ انہیں باہر بھجوایا جاتا ہے۔ مالک عموماً کٹائی اور پیکنگ کے دنوں میں یہاں آتا ہے... مالک کی کوٹھی بہت خوبصورت ہے۔ یہ ابھی دو تین سال قبل نئے مالک نے تعمیر کروائی ہے۔ اس سے پہلے اس کے والد شاذ ہی یہاں آتے تھے۔ اور جب آتے تھے تو ہمارے یہاں ہی قیام ہوتا تھا۔ نیا مالک نہایت محنتی اور کام میں دلچسپی لینے والا ہے۔ اس نے جزیرے کی کایا

پلٹ دی ہے۔اس جزیرے سے اُسے خاص رغبت ہے۔اسی لئے اپنے قیام کے لئے یہیں کوٹھی بھی تعمیر کروائی ہے...'' پھپھو بتاتی گئیں۔

اُسے یہاں آئے ہوئے ہفتہ بھر ہو چکا تھا۔اس دوران وہ تقریباً روزانہ باہر نکلتی تھی۔کبھی پھپھو کے ساتھ اور کبھی ضد کر کے عبداللہ کے ساتھ اُس کی ڈیوٹی پر۔

کبھی اونچے قد آور درختوں، کبھی بے قاعدگی سے اُگے پاموں تو کبھی کبھی نوخیز جھاڑیوں میں سے گزرتے کچے پیچ وخم کھاتے راستے پر سے ہوتے ہوئے مختلف گھروں اور مختلف جگہوں پر انڈے اور مرغیاں پہنچانا اُسے بہت اچھا لگتا تھا۔

اب تو یہاں کے لوگ بھی اُسے جاننے لگے تھے۔ بہت پُر خلوص انداز میں اُسے خوش آمدید کہتے۔اپنے مخصوص لہجے میں اس کا حال احوال پوچھتے۔گو اُسے رہ رہ کر اپنے پاپا، اپنے گھر کا خیال ستاتا ـــ مگر ـــ یہاں پھپھو کی محبت، سادہ اور پر سکون ماحول، غریب اور مخلص لوگ۔ کافی حد تک اس کا دھیان بٹانے میں معاون ثابت ہوئے۔ہاں وہ شہر کی رونقوں، کلبوں محفلوں کی دلدادہ ہوتی جیسا کہ اُس کی کئی دوستیں تھیں تو شاید اُسے کمی کا احساس ہوتا ـــ پھر غالباً اس کا یہاں ایک پل کو بھی دل نہیں لگتا۔

مگر ـــ اس کے برعکس وہ بہت سادہ طبیعت کی تھی۔ اس کی تیز وطرار دوستیں اُسے بیوقوف سمجھتیں۔سادہ لوح گردانتی تھیں۔

گو ماں کی موجودگی سے جو قدم قدم پر احتیاط وتدابیر سکھلائی جاتی ہیں، اس عمر میں خاص طور سے جو پابندیاں عائید کی جاتی ہیں، بچپن کی حدود سے نکلنے کے بعد جو لڑکی کو لڑکوں سے

فاصلہ رکھنے کے آداب سکھائے جاتے ہیں۔ وہ بدقسمتی سے محروم تھی۔

مرد بھی اسے مرد لگا ہی نہیں تھا۔ وہ کسی بھی لڑکے سے اسی طرح بات کرتی جس طرح وہ کسی لڑکی سے کرتی تھی، بے دھڑک، بلا جھجک۔

کہ ایسی کوئی حد براری وہ جانتی ہی نہیں تھی۔ یہ سب تو___ ایک ماں سکھاتی ہے، یہ فاصلے تو ایک ماں کے اندیشے ہی جانتے ہیں، یہ حدود تو ایک ماں کے وسوسے ہی مرتب کرتے ہیں۔

اور وہ___ قدم قدم پر ایسی نگرانی کرنے والی ہستی سے محروم تھی۔

مگر___ پھر بھی___ اُسے قدرت نے خود اپنا تحفظ دیا تھا۔ آج تک کبھی کوئی لڑکا اُسے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکا تھا۔ اپنی بے پناہ معصومیت ہی اس کا ڈھال بنی تھی۔

پھر شاید___ ذوالفقار علی نے مرتے مرتے اسے اپنی منہ بولی بہن کی تحویل میں دینے کی وصیت اسی خیال سے کی تھی۔ کہ دشمنوں کی نظروں سے اوجھل ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اسے ماں جیسا نہ سہی ایک خیر خواہ کا سا سنبھالا ضرور دیں گی۔ اور اگرچہ پھپھو خود بے اولاد تھیں مگر اُسے پا کر جیسے خدا تعالیٰ نے اُن کی یہ کمی پوری کر دی تھی۔ وہ ہر قدم پر اس کا خیال رکھتیں۔ اُس کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتیں، حتی الوسع اُسے بھی خوش رکھتیں اور خود بھی___ بے انداز خوش تھیں۔

عبداللہ کو پرسوں سے بخار ہو رہا تھا۔ کل بھی پولٹری تقسیم کروانے وہ پھپھو کو ڈرائیو کر کے لے گئی تھی۔ اپنے کام کے ساتھ ساتھ عبداللہ کے حصّے کا کام بھی پھپھو کے کندھوں پر آ پڑا تھا۔ اتنی ساری مرغیوں کی دیکھ بھال، گھر کا سارا کام___ اور عبداللہ کی تیمارداری۔ بچاری پھپھو کو سر پیر کا ہوش نہیں تھا۔

''پھپھو پولٹری دینے کی تو بہت دیر ہو گئی''۔ وہ کچن میں پھپھو کو عبداللہ کیلئے ناشتہ تیار کرتے

دیکھ رہی تھی۔

''نا بیٹا آج نہیں ہو سکتا''۔ وہ پریشان سی بولیں۔ ''پیچھے سارا کام پڑا ہے''۔

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ہو سکتا ہے عبداللہ کل بھی کام پر جانے کے قابل نہ ہو۔ گھروں کی تو خیر اتنی بات نہ تھی پر ہوٹیل___ اور پھر مالک کے یہاں تو پولٹری ہر حال میں پہنچنی ضروری تھی۔ وہ جانتی تھی پھپھو بہت خیال رکھتی تھیں اس بات کا۔ مگر شاید بہت مجبور ہو گئی تھیں۔

''پھپھو میں دے آؤں جا کر''۔ تجویز کے ساتھ ساتھ جیسے یہ اس کی اپنی خواہش بھی تھی۔

''ہیں___ تم جاؤ گی؟'' پھپھو کی بے ترتیب سرمے والی بڑی بڑی آنکھیں بے یقینی سے کچھ اور پھیل گئیں۔

''ہاں''۔

''تم___ پولٹری تقسیم کرو گی جا کر؟'' وہ کام وام چھوڑ کر اُس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''تو کیا ہوا پھپھو۔ اپنا کام کرنا کوئی بُری بات تو نہیں''۔

''نہ___ تم نہیں کرو گی یہ کام''۔ کیتلی میں کھولتے پانی میں چائے کی پتی ڈالتے ہوئے وہ فیصلہ کن لہجے میں بولیں۔

''پھپھو۔ میرا خود بھی دل کرتا ہے جانے کو''۔

''اے دل کرتا ہے تو ہو آیا کرو عبداللہ کے ساتھ ...''۔

''مگر وہ تو بیمار ہے''۔

''ارے ہو جائے گا ٹھیک ٹھکو''۔

''پلیز پھپھو۔ آپ بھی تو جاتی ہیں دینے''۔

''میری الگ بات ہے...''۔

''کیسے الگ بات ہے''۔ اُسے جیسے اچھا نہ لگا۔

وہ تو انہیں سچ مچ اپنے پاپا کی بہن سمجھتی تھی۔ پھپھو کہاں سے اونچ نیچ لے آئیں۔

"بس مجھے اچھا نہیں لگتا"۔

"اور آپ جو دینے جاتی ہیں وہ اچھا لگتا ہے"۔

"میرا کیا ہے کوئی بھی کام کروں"۔

"ایسا کیوں کہتی ہیں پھپھو۔ ہم دونوں الگ تھوڑی ہیں"۔ وہ دُکھی سی ہوگئی۔

"لیکن یہ کام نہیں کروگی کہہ دیا بس"۔ وہ کیتلی میں دودھ ڈالتے ہوئے بولیں۔

"پھپھو مجھے خود بھی اچھا لگتا ہے یہ سب۔ اور پھر میں پاکستان میں نہیں ہوں کہ لوگ کہیں کہ فلاح کی بیٹی پولٹری تقسیم کرتی ہے۔ اور پھر اب ۔۔۔ وہ سب کچھ ۔۔۔ رہا بھی کب ہے۔۔۔"۔

"مشعل"۔ انہوں نے کام وام چھوڑ جھٹ اس کا سر سینے سے لگا لیا۔ "خبردار جو آئندہ ایسا سوچا بھی ہو ۔۔۔ دکھ سکھ آتے رہتے ہیں۔ خدا جو ہے ہمارا۔ اور جن کا خدا ہے وہ کبھی تہی دامن نہیں ہوتے۔۔۔" پھپھو کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

اور ۔۔۔ مشعل نے بھی ایک عزم سے سُرخ آنکھیں مل لیں۔

مسٹر خان کیلئے نفرت کا ایک زبردست ریلا اس کے پورے سراپے میں سرایت کرگیا۔

وہ روئے گی نہیں۔ اُس نے سوچا۔

اپنی کوٹھی چھڑوائے گی اس کمینے سے۔ اُس کی یہ مذموم خواہش کبھی پوری نہیں ہونے دے گی۔

کیسے چھڑوائے گی؟ یہ اس کے معصوم ذہن سے بالاتر تھا۔

اُس نے بار ہا سوچا تھا، کوئی حل نظر نہیں آیا تھا۔ مگر اس کے باوجود ۔۔۔ وہ پُر امید تھی۔ کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی دن ۔۔۔ ایسا ہوگا۔

"پھپھو جانے دیں مجھے"۔ وہ اب سنجیدہ تھی۔ یہ کام اچھا لگنے کے ساتھ ساتھ جیسے اب

اس کی ذمہ داری بھی تھا۔

"مجبور نہ کرو بیٹا"۔

"پھپھو اپنا کام خود کرنا کوئی بُری بات نہیں"۔

"مجھے پتہ ہے مگر۔۔۔"۔

"تو پھر پلیز جانے دیں"۔

اور پھپھو نے گہری سانس لی۔

اداسی کے ساتھ ساتھ وہ اس کی ضد کے آگے لاجواب سی بھی لگ رہی تھیں۔

"بہت ضدی ہو"۔

"جاؤں پھر؟"

"جاؤ"۔ پھپھو نے اُسے ماتھے پر بوسہ دیا۔ "مگر آئندہ کبھی الٹی سیدھی باتیں مت سوچنا۔ تم اداس ہوگی تو میں آخرت میں اپنے بھائی کو کیا منہ دکھاؤں گی"۔ وہ اور بھی اداس ہوگئیں۔

"وعدہ پھپھو"۔ معصوم سی مشعل عزم سے کہنے لگی۔ "آئندہ ایسا کبھی نہیں سوچوں گی"۔

اس کے باوجود وہ بہت اداس تھی۔

"کچھ کھانے کو ساتھ لیتی جاؤ۔ تم نے ناشتہ بھی ٹھیک سے نہیں کیا"۔ انہوں نے چھوٹی سی الماری میں رکھے قیمے کے ڈونگے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں پھپھو وہیں ہوٹل سے کچھ لے لوں گی"۔ اُسے چھوٹے سے ہوٹل کا خیال آیا۔ جو مزدور طبقے کے لئے کھانا وغیرہ تیار کرتا تھا۔

"اے ہوش میں تو ہو تم۔۔۔"۔ ایک بار پھر انہوں نے آنکھیں نکالیں۔

اور ۔۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مشعل کو ہنسی آگئی۔ پھپھو نے شاید تھوڑی دیر قبل نم آنکھیں ملی تھیں۔ سرمہ پھیل کر اُن کے گالوں تک آرہا تھا۔

"مجھے اچھا لگتا ہے وہ کھانا پھپھو"۔

"ارے تمہاری باتیں تو میرا بھیجہ پھرائے ہیں..." انہوں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

اور ___ ان کی شفقت بھری تنبیہہ پر مسکراتی ہوئی وہ باہر کی طرف بڑھی۔

اور پھر ___ پھپھو کی مدد سے وین میں آگے انڈے رکھے اور پیچھے جالی میں مرغیاں بھر کر۔ وہ خوش خوش چل دی۔

موسم بے حد خوبصورت ہو رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر سیاہ گھٹائیں منڈلانے لگی تھیں۔ قد آور درخت ہوا میں جھوم رہے تھے۔ گھنی سرسبز جھاڑیوں میں سرسراہٹ سی ہو رہی تھی۔

تاحدِ نظر ہریالی، بے شمار بادل اور ہوا کے مدھر جھونکے۔ مختلف جگہوں پر انڈے اور مرغیاں بانٹتی وہ مسحور سی آگے بڑھ رہی تھی۔

معاً ___ وہ مرغیوں کی پھڑ پھڑاہٹ سے چونکی۔

مڑ کر دیکھا ___ ایک کے بعد دوسری۔ مرغیاں بڑے مزے سے وین سے نیچے کود رہی تھیں۔

اُس نے فوراً گاڑی روک لی۔

جلدی سے اتر کر پیچھے گئی۔ جانے کس طرح؟ دروازہ کھلا تھا۔ اور مرغیاں ہنوز نیچے اترنے میں مصروف تھیں۔

"اوہ۔ نو"۔ غصہ میں اُس نے آگے بڑھتی مرغی کو اندر دھکیلا۔ پھر عنقریب اترتی مرغی کو گردن سے دبوچا۔ اندر دے مارا۔

اور پھر ___ بھاگی درختوں کے بیچ باقی مرغیوں سے پیچھے۔

تھوڑی تگ و دو کے بعد ایک کو پکڑ ہی لیا۔ واپس آکر۔ دروازہ کھول کر وین میں ڈالنے لگی ___ تو وہ اور مرغیاں ایک ساتھ نیچے کود پڑیں۔

اُس نے دونوں مٹھیاں بھینچ لیں۔ غصے میں دانت پیسے۔

اور پھر۔ آپے سے باہر ہوتے ہوئے ___ ایک کے بعد ایک ___ وین سے مرغیوں کو باہر پھینکنے لگی۔

دفعتاً کسی نے پاس آکر اُس کی کلائی پکڑ لی۔ مرغی اس کے ہاتھ میں پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔

نظریں اٹھا کر اس نے دیکھا۔

وہی آدمی تھا۔ اُس شام والا ___ جسے پھپھو نے اُسے لینے ائیر پورٹ بھیجا تھا۔

وہی اختیار تھا اس کی آنکھوں میں۔ وہی جلال تھا پورے سراپے میں۔

اُس کی سرخی مائل نسواری آنکھوں میں دلنشین چمک تھی۔ پرکشش ہونٹ ہنسی کا بار اٹھانے سے قاصر لگ رہے تھے۔

وہ کچھ بوکھلا سی گئی۔ جانے کیا تھا اِس آدمی میں، اس کے انداز میں۔

نہ چاہتے ہوئے بھی۔ وہ بعض اوقات بدحواس سی ہو جاتی تھی۔

"یہ ___ کیا ہو رہا ہے سب"۔ اب وہ سنجیدہ تھا۔

وہ بھی سنبھل گئی۔

"کچھ نہیں"۔ لاپرواہی سے کہتے ہوئے اس نے اُس سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ اور مرغیوں کو دور پھینک دیا۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟" آگے بڑھتے ہوئے اُس نے جالی کا دروازہ بند کر دیا۔

"دیکھ تو رہے ہیں"۔ وین سے نکلتے ہوئے اُس نے مزید لاپرواہی سے کہا۔

اُس کے محسوسات ملے جلے سے ہو رہے تھے۔ کچھ اپنی حرکت پر خفیف سی تھی، کچھ اُس کی آن بان دیکھ کر اپنی موجودہ کم مائیگی کا احساس ہو چلا تھا جیسے۔ اس وقت اس کی مداخلت سے کچھ تلخ سی ہو رہی تھی۔

''دیکھ رہا ہوں۔ بڑی دیر سے دیکھ رہا ہوں...''۔

مشعل نے دیکھا اُس کی گاڑی اُس کے پیچھے کھڑی تھی۔

جانے کب سے دیکھ رہا تھا اُسے اور اس کی حرکتوں کو۔

کوئی جواب دیئے بنا وہ ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھی۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' وہ ایک قدم آگے بڑھ آیا۔

''پولٹری دینے''۔

''وہ''۔۔۔ وہ قدرے رُکا۔ ''پہلے کون دیتا تھا؟''

''پھپھو کا ملازم''۔

''پھر؟''

''وہ بیمار ہے''۔ اُس نے مختصراً کہا اور آگے بڑھ گئی۔

''تو۔۔۔ تم کیوں کر رہی ہو یہ سب؟'' اُس کی آواز میں تعلق سا تھا، وہ اُلجھا اُلجھا سا لگ رہا تھا۔

''پھر کون کرے گا''۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے لہجے میں دکھ سا اُبھر آیا۔

''اوہ''۔ وہ مزید اُلجھ گیا۔ ''میں آنٹی کے لئے... میرا مطلب ہے دوسرا ملازم رکھا جا سکتا ہے''۔

''وہ دوسرا ملازم AFFORD نہیں کر سکتیں''۔ وہ سیٹ پر جا بیٹھی۔

وہ بھی کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔

''تم۔۔۔ بات تو سنو''۔ جیسے وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ کام کرے۔ کسی طرح روکنا چاہتا تھا اُسے۔

''کیا؟''

''کہاں دینے جا رہی ہو؟ کون سی جگہ باقی ہے؟''

وہ تو جیسے سب جانتا تھا۔ واقف تھا پورے جزیرے سے۔

''مالک باقی رہتا ہے''۔

''اوہ''۔ اس کے لہجے میں جیسے کرب سا اُبھر آیا۔ ''چھوڑو اس کو...''۔

مشعل کو اچانک۔۔۔ وہ اچھا سا لگا، ہمدرد سا، اپنا سا۔ پھپھو کی طرح اُسے اس کا یہ سب کرنا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

''کیسے چھوڑوں۔ مرغیاں انڈے نہیں ملیں گے تو بھوکا رہ جائے گا بچارا''۔ مسکراتے ہوئے اس نے کہا۔

اور۔۔۔ اُس کی بات پر۔ وہ بے اختیار ہنس دیا۔

''اچھا چلتی ہوں...''۔

''اے''۔ وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ ''لائسنس بھی ہے تمہارے پاس؟''

''کیوں؟''

''مالک کے یہاں جاؤ گی تو وہ لائسنس دیکھے بغیر گھسنے دے گا؟''

''اوہ''۔ وہ کچھ بدحواس سی ہو گئی۔ ''وہ لائسنس بھی چیک کرتا ہے؟''

''جزیرے کا مالک ہے حق تو بنتا ہے، خاص طور سے جب وہ یہ دیکھے گا کہ تمہاری عمر ابھی لائسنس کے قابل نہیں''۔

''اوہ۔ ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ لائسنس ہے میرے پاس''۔ وہ گلو بوکس میں سے اپنا لائسنس نکالنے لگی۔

اور وہ۔ ہنسی ضبط کئے دلچسپی سے اُسے دیکھتا رہا۔

''ضرور کوئی فراڈ کیا ہے''۔ ہاتھ آگے بڑھا کر اُس نے اُس سے لائسنس لے لیا۔

"نن... نہیں تو"۔ وہ باقاعدہ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

"دیکھتا ہوں"۔ وہ صفحے پلٹنے لگا۔ "ہوں۔ تو ایک سال پہلے تم انیس سال کی تھیں۔ اور اب غالباً سترہ کی ہو..."۔ آنٹی نے اُسے بتایا تھا۔

مشعل کو یاد آیا۔ پچھلے سال پاپا اور بیرسٹر انکل نے جب اس کا غلط لائسنس بنوانے سے صاف انکار کیا تھا تو اس نے پاپا کے سیکرٹری کو یہ کام کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ اور یوں اُس کی عمر سولہ کی بجائے انیس لکھوا کر وہ لائسنس حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"آپ سے مطلب"۔ اُس نے اپنا لائسنس اُس کے ہاتھ سے اُچک لیا۔

"کچھ نہیں۔ مگر ـــ" جیسے وہ اب بھی اسے جانے دینے پر آمادہ نہ تھا۔

"کیا؟"

"یہ جو مرغیاں ہیں"۔ اُس نے لمبے لمبے آڑھے ترچھے پام کے درختوں کے بیچوں بیچ پھرتی مرغیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "انہیں تم یوں ہی چہل قدمی کرتے چھوڑ کر جاؤ گی۔ آنٹی کا نقصان نہیں ہوگا؟"

اور یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔

"اوہ"۔ وہ جلدی سے اُتر آئی۔

اور ـــ ٹپ ٹپ موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں۔

وہ تیزی سے مرغیوں کے پیچھے اِدھر اُدھر بھاگنے لگی۔

"اے"۔ اس نے پاس جا کر اُسے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ وہ اُسے اتنی چھوٹی اور معصوم سی لگتی تھی کہ کوئی تکلف برتنا گویا زیادتی تھی اس کے ساتھ۔ "یہ تمہارے بس کا کام نہیں ہے"۔ وہ اُسے ایک گھنے درخت کے نیچے لے آیا۔ "بیٹھو یہاں"۔ اُس نے اسے اپنے ساتھ بہت پرانے درخت کی پھیلی ہوئی موٹی موٹی جڑوں کے اوپر بٹھا لیا۔

"میں نے جانا ہے"۔ اُس نے احتجاج کیا۔

"اس بارش میں نہیں جاؤ گی"۔ اُس کا فیصلہ اٹل تھا۔

"مگر وہ ـــ مالک..."۔

"اچھا ہے بھوکا رہے"۔ اُس نے تیز بارش میں ارد گرد دیکھتے ہوئے اُسی کی بات دہرائی۔

"اوہ نو۔ پھپھو خفا ہوں گی"۔

"وہ خفا ہونے والی چیز نہیں ہیں"۔

"پھر بھی۔ وہ بوس ہے جزیرے کا"۔

"جزیرے کا ہے آنٹی کا نہیں ہے"۔ وہ درخت سے ٹیک لگائے دونوں ٹانگیں سیدھی پھیلائے سامنے دیکھتے ہوئے لاپرواہی سے بولا۔

"آپ کو کیسے معلوم؟"

"ہوں ـــ وہ ـــ پتہ ہے مجھے۔ آنٹی بتاتی رہتی ہیں۔ بہت مانتا ہے انہیں"۔ وہ اپنی سفید بے داغ قمیص پر سے درخت میں سے چھن چھن کر آتی بارش کی بوندیں صاف کرتے ہوئے بولا۔

وہ متجسس سی اب بھی اُسے دیکھ رہی تھی۔

"پھپھو۔ آپ کی کیا لگتی ہیں؟" اُس نے اچانک سوال کر دیا۔ وہ پھپھو کا کون تھا؟ یہ سوال دو ایک بار پہلے بھی اس کے ذہن میں اُبھرا تھا۔

"میری؟"

وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ "آنٹی لگتی ہیں"۔

"نہیں"۔ وہ معصومیت سے ہنس دی۔ "اُن کا کوئی رشتہ دار نہیں ہے"۔

"اوہ"۔ وہ بھی ہنس دیا۔ "ہم لوگ ہم وطن تو ہیں۔ آنٹی ہی ہوئیں"۔

"آپ ـــ یہیں رہتے ہیں"۔ اُس نے ایک اور سوال کر دیا۔

"کبھی کبھار آتا ہوں"۔ وہ جیسے کچھ سوچنے لگا۔ "دراصل ـــــ یہاں کا مالک میرا دوست ہے..."۔

اور ـــــ مشعل کے تمام بات سمجھ میں آ گئی۔

اتنی قیمتی گاڑی، اتنی آن بان والا یہ آدمی اس جزیرے پر کیا کر رہا تھا۔

"ویسے آپ کا یہ دوست میری سمجھ میں نہیں آیا"۔

وہ چونک سا گیا۔

"کیا مطلب؟"۔

"اب دیکھیں نا۔ یہاں اپنے جزیرے پر اس نے ٹیوب ویل لگا رکھے ہیں، ڈیری فارم بنایا ہے، پولٹری فارم کا بندوبست کر دیا ہے۔ یہاں سے باہر آنے جانے کی سہولت موجود ہے۔ مگر"ـــــ

"مگر کیا؟" وہ متجسس سا اُسے دیکھ رہا تھا۔

"میں ہوتی نا اس جزیرے کی مالک پھر آپ دیکھتے"۔

وہ خوبصورتی سے ہنس دیا۔

"کیا کرتی تم؟"

"قدم قدم پر فاسٹ فوڈ کی دکانیں ہوتیں، چکن سوپ ہوتا، برگرز ہوتے، آئس کریم ہوتی، کولڈ ڈرنکس اور چوکلیٹ ہوتی..."۔

اور ـــــ اُس کا فلک شگاف قہقہہ گونج اٹھا۔

وہ حیرت سے اُسے دیکھنے لگی۔

"میں اُسے کہوں گا۔ تمہاری اس تجویز پر غور کرے"۔

"یہ ہوئی نا بات"۔ وہ بے حد خوش ہو کر بولی۔

"دراصل اُسے معلوم نہیں ہے نا کہ تم بھی اس جزیرے پر"ـــــ وہ اب بھی ہنس رہا تھا۔

"یہ بارش کب رُکے گی"۔ وہ اچانک پٹڑی بدل گئی۔

"پوچھ کر بتاتا ہوں اس سے"۔

اور ـــــ اس کی بات پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"اسی طرح ہنستی رہا کرو، خوش رہا کرو سمجھیں"۔ وہ بالکل یوں بولا۔ جیسے اُس کی خوشی میں خوش رہنے والا کوئی خیر خواہ ہو اس کا۔

"اچھا"۔ وہ بھی مصالحت آمیز لہجے میں بولی۔ "اب تو جاؤں"۔

"ہاں"۔ وہ اُٹھ آیا۔ گو بارش اب بھی تھی مگر دیر خاصی ہوگئی تھی مشعل کا گھر جانا ضروری تھا۔ "چلو تمہیں گھر چھوڑ آتا ہوں"۔

"نہیں میں وین سے چلی جاؤں گی"۔

"وین کو یہیں رہنے دو۔ میں آدمی بھیج دوں گا۔ وہ مرغیاں بھی سمیٹ لے گا اور وین بھی گھر پہنچا دے گا۔

وہ خاموشی سے ساتھ ہو لی۔

عبداللہ کا بخار طول پکڑتا گیا۔ تشخیص کرنے پر معلوم ہوا کہ ٹائیفائیڈ تھا۔

گھر کا کام کاج، مرغیوں کی دیکھ بھال۔ اوپر سے عبداللہ کی تیمارداری۔ پھپھو کا حلیہ آج کل دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ میلی ساڑھی، یہاں کے لوگوں کی دیکھا دیکھی وہ ساڑھی جو باندھنے لگی تھیں۔ بال چڑیوں کا گھونسلہ بنے ہوئے۔ پاؤ پاؤ بھر سرمہ فی آنکھ ضرور ڈالے ہوئے۔

اس پر مصر کہ مشعل پولٹری دینے نہیں جائے گی۔

"آج جا کے بات کرتی ہوں مالک سے۔ کردے بندوبست دوسرے آدمی کا عبداللہ جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتا۔ بہت دے آئیں تم جا جا کے..."۔

اور مشعل کی جان ہی تو نکل گئی۔ اس کام میں تو اُسے بڑا مزا آتا تھا۔

پھر مصروف بھی رہتی تھی، بہل بھی جاتی تھی، پچھلی باتوں سے دھیان بھی ہٹا رہتا تھا۔

"پھپھو مجھے اچھا لگتا ہے نا"۔

"گھروں میں جا جا کے مرغیاں انڈے دینا"۔ اُن کی آواز میں غصہ تھا مگر لہجہ پیار میں ڈوبا۔

"ہاں"۔

"اے لڑکی تم حواسوں میں تو ہو"۔

"ہاں پھپھو"۔ وہ ہنس دی۔

"دیکھ غصہ نہ دلاؤ"۔

"میری اچھی پھپھو"۔ مشعل نے اُن کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ "آپ کو پتہ ہے یہ سب کرنے میں مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے"۔

"اے سچ کہتی ہو"۔ وہ اچانک سنجیدہ ہو گئیں۔

"ہاں پھپھو مجھے اچھا لگتا ہے۔ مصروف رہتی ہوں تو مجھے ___ گھر بھی یاد نہیں آتا"۔

اور پھپھو کی بڑی بڑی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

"اے یہ بات تھی تو پہلے کیوں نہیں بتایا"۔ انہوں نے آنکھیں ساڑھی کے پلو سے پونچھیں۔

"میں تو کہتی ہوں آپ سنتی کہاں ہیں"۔ اُس کی نظر اُن کے گالوں تک پھیلے سرمے پر پڑی۔

"اے تو جاؤ پھر ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہی ہو"۔ انہوں نے شفقت سے مسکراتے ہوئے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

"کتنی سویٹ ہیں آپ پھپھو"۔ وہ اُن کی ساڑھی کے پلو سے اُن کا پھیلا ہوا سرمہ صاف کرنے لگی۔

اور پھر ___ وین میں پولٹری بھر ___ یہ جا وہ جا ___

اس نے تقریباً سب جگہوں پر انڈے اور جہاں جہاں ضرورت تھی مرغیاں پہنچا دی تھیں۔ ایک دو ہی گھر باقی رہتے تھے۔ پتہ نہیں کیوں گیارہ ہی بجے تھے مگر اُسے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ گاڑی تھوڑی آگے لے جا کر اُس نے چھوٹے سے ہوٹل کے سامنے کھڑی کر دی۔

بانس اور پام کے خشک پتوں کا بنا یہ جھونپڑی نما ہوٹل اور اس کے آگے لگی کین کی کرسیاں اُسے

ہمیشہ اچھی لگتی تھیں۔

اُتر کر اُس نے گرم گرم کٹلس بن میں بند کروا کے برگر سا بنوایا اور وہیں ہوٹل کے آگے کرسی پر بیٹھ کر کھانے لگی۔

تبھی اُس نے دیکھا۔ وہی آدمی وہاں سے اپنی گاڑی میں دھیمی رفتار کیے گزر رہا تھا۔

مشعل پر نظر پڑتے ہی اس نے گاڑی روک لی تھی، اُتر آیا تھا، ہوٹل کا مالک لپک کر اس کی طرف بڑھا تھا، نہایت مؤدب طریق سے اُسے خوش آمدید کہا تھا، اس نے ایک کپ چائے کا آرڈر دیا تھا۔ اور پھر ــــ

اس کے قریب چلا آیا تھا۔

ہوٹل کا چھوٹا سا نوکر دوڑ کر پاس آیا۔ اور اُس کی وہیں مشعل کے پاس بیٹھنے کی نیت بھانپ کر جھٹ قریبی کرسی گھسیٹ کر اُسے پیش کر دی۔

''شکریہ''۔ اُس نے چھوٹے سے لڑکے کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے خوش اخلاقی سے کہا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

غور سے چند لمحے اُس کی پلکیں جھپکاتی آنکھوں میں دیکھا اور پھر ــــ ایک گہری سانس لی۔

''تم ــــ یہاں کیوں آئی ہو''۔

''کیوں؟'' برگر کھاتے کھاتے وہ رُک سی گئی۔

''تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ ہر جگہ یوں بیٹھ جانے کی نہیں ہوتی''۔

''آپ بھی تو آکر بیٹھے ہیں''۔

''میری بات اور ہے''۔

اور وہ ــــ الجھ کر رہ گئی۔

''کیوں اور ہے؟''

اور ــــ اُس نے پھر گہری سانس لی۔

تبھی ــــ ہوٹل کا مالک اُس کے لئے صاف سی ٹرے میں برتن سجائے چائے لے آیا۔

وہ گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگا۔

''تم ابھی بہت چھوٹی ہو۔ نہیں سمجھتی ہو یہ باتیں''۔

''میں چھوٹی نہیں ہوں''۔ وہ پھر سے برگر کھانے لگی تھی۔

اس کی دلنشین آنکھیں اُٹھیں ــــ ایک پل کو اُسے غور سے دیکھا۔ اور ــــ وہی مخصوص مبہم سی مسکراہٹ اُس کے پُرکشش لبوں کو چُھو گئی۔

''آج پھر پولٹری دینے نکلی ہو گی''۔

''ہاں''۔

''ملازم ٹھیک نہیں ہوا اب تک؟''

''اُسے ٹائیفائیڈ ہو گیا ہے''۔

''اوہ۔ آنٹی کو چاہیئے تھا اطلاع کرتیں...''۔

''لے کر گئی تھیں اُسے بڑے جزیرے پر ڈاکٹر کے پاس۔ وہیں پتہ چلا ٹائیفائیڈ ہے۔ دوائی شروع کر دی ہے...''۔

''اور تم نے موقعہ اچھا سمجھتے ہوئے اُس کی ڈیوٹی سنبھال لی''۔ اُسے معلوم تھا اس کام میں اُسے تھرل محسوس ہوتا تھا۔ اب تک وہ اچھی طرح جان گیا تھا اُسے۔

''ہاں۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے''۔

''اور مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا''۔

غیر ارادی طور پر مشعل کی نظریں اٹھیں۔ اُس کی سرخی مائل نسواری آنکھیں اُس پر جمی

تھیں۔ اُن میں بہت اپنائیت تھی، گہرا تعلق تھا، فکر تھی۔

اُس کی پلکیں لرزسی گئیں۔ نظریں پھر سے برگر پر جم گئیں۔

اور ــــ ایک بار پھر ــــ وہی غیر محسوس سی، مبہم مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"آج شام تک ملازم کا بخار کم نہ ہو تو آنٹی سے کہنا مالک کو اطلاع کر دیں"۔ اُس نے خالی کپ میز پر رکھا۔ "اور اب گھر چلو اچھا"۔ وہ اٹھنے لگا۔

"اچھا"۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔ اور کرسی سے اُٹھ آئی۔

دونوں اپنی اپنی راہ چل دیئے۔

ابھی تھوڑی ہی دُور گئی تھی۔ کہ اسے لگا ــــ پچھلے پہیے کا پنکچر ہو گیا ہے۔

گھبرا کر وہ گاڑی سے اتر آئی۔ ڈرتے ڈرتے دائیں پچھلے پہیے کو دیکھا۔

"اوہ نو"۔ وہ روہانسی ہو گئی۔ وہ پہیہ بدلنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اُس نے ہمیشہ نئی گاڑی استعمال کی تھی۔ اور ڈرائیونگ کے مختصر سے تجربے میں اکیلے میں کبھی اسے پنکچر ہوا ہی نہیں تھا۔

یہاں سے تو کوئی گاڑی بھی نہیں گزرتی تھی۔ گاڑیاں تھیں بھی کتنی اس جزیرے پر؟ یا یہ وین تھی یا ایک چھکڑا سی سائیکل رکشہ یا پھر اس آدمی کی کار۔

دو چار دکانیں تھیں جو وہ پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ یہاں آس پاس تو کسی کا مکان بھی نہیں تھا۔

اور وہ ــــ وہیں قریب درخت سے ٹیک لگا کر، آنکھوں پر بازو رکھ کر، بڑے اہتمام سے رونے لگی۔

"کیا ہوا؟" پاس آ کر کسی نے دھیمی آواز میں پوچھا تھا۔

اس نے بازو ہٹایا۔ وہی آدمی تھا۔

اور وہ ــــ اور بھی زور شور سے رونے لگی۔

"ہوا کیا؟" اس کے انداز پر وہ بمشکل ہنسی روک سکا۔

"پنکچر ہو گیا ہے"۔ اس نے روتے روتے بتایا۔

اور ــــ اُس نے تھکی سی سانس لی۔

"یہ تو میں بھی نہیں لگا کر دوں گا"۔ وہ اُس کے قریب ہی گھاس پر بیٹھ گیا۔

"کیوں؟" وہ بڑی بڑی بھیگی آنکھیں لئے اُسے دیکھنے لگی۔

ایک پل کو اُس نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

لمبی سیاہ نوکیلی پلکوں تلے ــــ اُس کی نم نیلگوں آنکھوں میں سُرخ ڈورے بہت واضح تھے۔

اُس نے گھنی پلکیں جھپک لیں۔ پھر ــــ سر درخت کے تنے سے ٹکا لیا۔ دلنشین آنکھیں موند لیں۔

"کیوں کہ میں بہت تھکا ہوا ہوں"۔

"تو پھر۔ یہ کون کر کے دے گا؟"

اچھی زبردستی تھی۔ وہ ہنس دیا۔

"میں تمہیں گھر پہنچا سکتا ہوں"۔ وہ پھر اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا تھا۔

"اور یہ ــــ وین؟"

"یہ بھی گھر پہنچ جائے گی تمہارے"۔

"اچھا"۔ اُس نے جیسے سمجھوتہ کر لیا۔

"ویسے ــــ اب بھی وقت ہے باز آ جاؤ اپنی معرکہ آرائیوں سے، ایڈونچرز سے..." وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھ دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

وہی سُرخ نسواری آنکھیں۔ جن میں ــــ اپنائیت تھی، پروا تھی، فکر تھی اُس کے لئے۔

ساتھ ہی۔۔۔ چمک تھی، شوخی تھی، شرارت تھی، بقول اس کے اُس کی معرکہ آرائیوں پر۔ اُس کے ایڈونچرز پر۔

''آپ۔۔۔ آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں''۔ اُس کی آواز پھر بھرائی، آنکھیں ایک بار پھر نم ہونے لگیں۔

اور وہ اُسے۔۔۔ یکدم بچہ لگی، دو تین سال کی منہ بسورتی روتی چلاتی۔

''میری ہمت ہے، مجال ہے میری''۔

اور اُس کے انداز پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

بوائے کٹ بال، رنگ برنگی چھوٹی چھوٹی گڑیوں والی پرنٹ کی ڈھیلی ڈھالی قمیص شلوار، سفید جوگرز پہنے۔ دونوں ٹانگیں گھاس پر سیدھی پھیلائے، کبھی روتی کبھی ہنستی یہ معصوم سی لڑکی خود بھی ایک گڑیا لگ رہی تھی۔ وہ سترہ سال کی تھی بھی یا نہیں۔ اسے شک سا ہونے لگا۔

''آؤ گھر چلیں''۔ نرمی سے کہتے ہوئے اُس نے اس کا ہاتھ آگے بڑھایا۔

مشعل نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور خاموشی سے اُس کے ساتھ گھر کی طرف چل دی۔

''پھپھو یہ آدمی کتنا اچھا ہے نا''۔ رات کچن کے آگے سبزی کی کیاریوں کے پاس لکڑی کے چھوٹے سے کھمبے میں لگے بلب کی روشنی میں کھانا کھاتے وہ اچانک بولی۔

پھپھو نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ پھر میز پر رکھا نظر کا چشمہ اُٹھایا۔ آنکھوں پر لگایا۔ ایک بار اور بہت غور سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''کون۔۔۔ شیر شاہ؟''

''اس کا نام شیر شاہ ہے''۔ وہ معصومیت سے پوچھنے لگی۔

''لو۔ ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں''۔

''اُس نے بتایا ہی نہیں''۔ اُس کی نظریں پلیٹ پر تھیں، معصوم چہرے پر انوکھی سی خوشی کی پرچھائیں تھی۔

''اے تو تم پوچھ لیتیں''۔ پھپھو کی مسکراہٹ میں شفقت بھی تھی ساتھ ہی کچھ جان جانے کی تجسس بھی۔

''میں۔۔۔ کیسے پوچھتی''۔ اُس کے خوبصورت چہرے پر رنگ سا دوڑ گیا۔ لمبی پلکیں لرز سی گئیں۔

اور۔۔۔ پھپھو جان گئیں۔

اس رنگ میں حیا کی لالی بہت نمایاں تھی۔ بوجھل پلکوں کی لرزش وہ راز کھول رہی تھی جس سے خود مشعل بھی اب تک آگاہ نہ تھی۔

''وہ تو سچ میں بہت اچھا ہے، مخلص، ہمدرد...''۔ اُس کی فرمائش پر بنائے ہوئے کوفتے اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے پھپھو بڑی سنجیدگی سے بولیں۔

رات بستر میں لیٹ کر اُس نے سرہانے رکھا میگزین اٹھا لیا۔

ایک دو صفحے پڑھے۔ اور پھر غیر ارادی طور پر قریب کی چھوٹی میز پر سے رنگین پنسلیں اٹھا کر اُسی رسالے پر جگہ جگہ حسب عادت آنکھوں کے سکیچ بنانے لگی۔ چھوٹی آنکھیں، بڑی آنکھیں۔۔۔ کبھی سیاہ پنسل سے کبھی براؤن سے۔ اور پھر۔۔۔

باقاعدہ بیٹھ کر اُس نے میز پر سے کاپی اٹھا کر آنکھیں بنانی شروع کیں۔

کبھی نسواری، کبھی سرخی مائل، کبھی دونوں رنگ ملا کر اُس نے جتنی بھی آنکھیں بنائیں۔

چونک کر دیکھا۔ سب شیر شاہ کی آنکھوں کے رنگ تھے۔ بالکل وہی، ہو بہو وہی۔

کچھ دیر کو وہ دم بخود سی رہ گئی۔ پھر معصومیت سے مسکرا دی۔

کاپی پنسلیں میگزین اٹھا کر واپس میز پر رکھے۔ لیمپ بجھایا اور بستر میں لیٹ گئی۔

آنکھیں موندلیں۔سونے کی کوشش کرنے لگی۔

"ویسے ـــ اب بھی وقت ہے باز آجاؤ اپنی معرکہ آرائیوں سے،ایڈونچرز سے..."۔

اُس کی آنکھوں میں دیکھتی شیر شاہ کی سُرخ نسواری آنکھیں اس کی بنائی ہوئی آنکھوں سے ہو بہو ملتی تو تھیں۔

اُس کا دل دھڑک سا اٹھا۔آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔

اندھیرے میں چھت کو گھورنے لگی ـــ مگر ـــ اُس اندھیرے میں بھی ـــ وہی سرخی مائل نسواری آنکھیں ـــ کبھی سنجیدہ،کبھی شوخ۔کبھی متین،کبھی شریر ـــ اُسے غور سے تک رہی تھیں۔مسلسل،ایک ٹِک۔

اس نے دیوار کی طرف کروٹ لے لی۔لیکن ـــ پھر وہی ـــ بڑی بڑی،مدبھری نشیلی آنکھیں اُس پر تک گئیں ـــ نہ سونے دینے کی قسم کھالی تھی جیسے انہوں نے۔

اور ـــ وہ جیسے تنگ آگئی۔زور سے آنکھیں میچ لیں۔

ون۔ٹو۔تھری۔فور..."۔دھیان بٹانے کو اُس نے گنتی شروع کردی۔

اور پھر ـــ نیند کی دیوی کو اُس پر ترس آہی گیا۔دھیرے دھیرے غنودگی طاری ہونے لگی۔

صبح آنکھ کھلی تو ـــ پہلا خیال وہی ـــ آپس میں گڈمڈ ہوتے سرخ نسواری رنگ۔وہ بھی شوخ،چمکیلے،روشن۔

"افوہ ـــ کیا مصیبت ہے ـــ جھنجھلاتے ہوئے اس نے کمبل پرے دھکیل دیئے۔

"میرا وہی پیچھا کر رہا ہے"۔بڑبڑائی ہوئی وہ باتھ روم میں گھس گئی۔

عبداللہ کا بخار کل شام ہی کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔اس وقت تو تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا۔پھپھواُسے مرغی خانے کے قریب اس کے چھوٹے سے چھپر نما کمرے میں ناشتہ دے کر ابھی ابھی کچن میں آئی تھیں۔مطمئن سی اپنے اور مشعل کے لئے ناشتہ بنانے میں مصروف تھیں۔

"پھپھو جلدی ـــ کام پر جانے کی دیر ہو رہی ہے"۔مشعل بھی کچن میں آدھمکی۔

"ابھی دیتی ہوں ـــ بس دو چار روز اور ہیں پھر عبداللہ اس قابل ہو جائے گا کہ اپنا کام سنبھال سکے۔

"نہیں پھپھو وہ ٹھیک بھی ہو جائے گا تب بھی میں ہی جاؤں گی پولٹری دینے۔آدمی تنگ بھی ہو جاتی ہے۔گھر میں بیٹھے بیٹھے سوچتی ہی رہتی ہوں"۔

"بس یہ تم میری دکھتی رگ جان گئی ہو"۔انڈا فرائی کرتے کرتے اُن کے ہاتھ رُک گئے،آواز یکدم بھرا سی گئی۔"جاؤ ـــ مجھے پتہ ہے تم خوش ہوتی ہو اور تمہاری خوشی میں ظاہر ہے میں بھی خوش ہوں"۔انہوں نے ساڑھی کے پلو سے آنکھیں رگڑیں۔

"تو پھر آئیں ناشتہ کریں جلدی سے"۔ وہ ناشتہ کی ٹرے اٹھاتے ہوئے لاؤنج میں چل دی۔

آگ بند کر کے پھپھو بھی میز پر آ گئیں۔

"پھپھو۔۔۔ شیر شاہ کی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں نا"۔ ناشتہ کرتے کرتے جیسے ایک بار پھر شیر شاہ کی آنکھوں نے اس کا محاصرہ کر لیا۔

"ہیں؟" پھپھو کا پراٹھے کی طرف بڑھتا ہاتھ رُک گیا۔

جھٹ میز پر سے چشمہ اٹھا کر آنکھوں پر دھر لیا۔ غور سے مشعل کو دیکھا۔

"کیوں؟ نہیں ہیں؟" اُس نے معصومیت سے سوال کیا۔

"ہیں بابا کیوں نہیں ہیں"۔ عینک اتار کر انہوں نے واپس میز پر رکھ دی۔ دوبارہ ہاتھ پراٹھے کی طرف بڑھایا۔ پر۔۔۔

مستقل مسکراہٹ ہونٹوں سے چپک گئی۔

اُن کے۔۔۔ رات والے شبے کو تقویت جو ملی تھی۔

عجیب عجیب سے رنگ ہیں۔ گلابی، سُرخ، نسواری۔ سب شوخ، چمکیلے، روشن۔۔۔"۔

اور پھپھو جیسے جل سی گئیں۔

"اے تمہاری آنکھوں سے زیادہ خوبصورت تھوڑی ہیں"۔

"نہیں۔۔۔ میری آنکھیں کیا ہیں اس کی آنکھوں کے سامنے"۔ وہ سادگی سے بولی۔

"اے بس رہنے دو۔۔۔ اُس کی آنکھیں کیا ہیں تمہاری آنکھوں کے سامنے"۔

"کبھی غور سے دیکھیں"۔ ہاتھ سے نیپکن سے صاف کرتے ہوئے اُس نے میز پر سے وین کی چابی اٹھائی۔ "خود ہی اندازہ ہو جائے گا"۔

۔۔۔ پھپھو کو نئی سوچوں میں غلطاں چھوڑ کر وہ۔۔۔ وین لے کر چلتی بنی۔

آج وہ سب سے پہلے جزیرے کے آخری سرے پر واقع مالک کی کوٹھی کی طرف چل پڑی۔

اس سے قبل وہ اس طرف نہیں آ پائی تھی۔ کبھی عبداللہ اُسے منیجر کے مکان پر چھوڑ "ابھی آیا جی" کہہ کر باقی کی ڈیوٹی کرنے چل دیا تو کبھی وہ خود راستے میں اپنی ہمعمر درزن کی بیٹی کے پاس اُسے جلدی کام نمٹانے کا کہہ کر بیٹھ رہی۔ ایک بار پھر پھپھو کو ڈرائیو کر کے لے گئی تھی مگر وہ بھی "عبداللہ کہتا تھا طبیعت کی خرابی کی وجہ سے اس نے مالک کے خانساماں سے آج کے لئے معذرت کر لی ہے"۔ کہہ کر اُسے آدھے راستے سے واپس لے آئی تھیں۔۔۔ اور۔۔۔ خود اس نے جب بھی ارادہ کیا شیر شاہ نے راستے میں مل کر واپس گھر چلتا کیا۔

آبادی سے پرے ساحل کے کنارے قدرے اونچائی پر بنی۔۔۔ گھنے قدآور درختوں میں گھری، اونچے ستونوں اور پھولوں سے لدی بالکنیوں والی مالک کی سفید مرمریں کوٹھی دور سے بہت پُرکشش لگ رہی تھی۔

گیٹ پر پہنچی۔۔۔ تو مسلح چوکیدار نے وین پہچان کر خود بخود ہی گیٹ کھول دیا۔

کہاں جا کر پولٹری دے؟ کچن کس طرف تھا؟

کوئی چہل پہل بھی نہ تھی۔ نوکر چاکر بھی جانے کہاں تھے۔ مکمل سناٹا تھا پوری کوٹھی میں۔

اُس نے گھڑی دیکھی۔ دس بجنے والے تھے۔

اوہ۔۔۔ مالک شاید سو رہا تھا۔ تبھی کسی چوں و چرا کرنے کی ہمت نہ تھی۔

اور۔۔۔ اُسے غصہ آ گیا۔ اگر وہ سویرے جاگ سکتی تھی، یہاں تک آ سکتی تھی۔۔۔ تو۔۔۔ مالک کیا انوکھا تھا اس دنیا میں؟

اُس نے اچانک لمبے لمبے ہارن دینے شروع کر دیئے۔

ایک بھونچال سا آ گیا۔ کئی دروازے کھلنے کی آوازیں آئیں۔

دو ملازم مختلف اطراف سے نمودار ہوتے ہوئے اس طرف سے دوڑے۔

وہ خوش خوش وین سے اُتر آئی۔ دونوں پہلوؤں پر ہاتھ رکھے وہ ایک فاتح کی طرح کھڑی تھی۔

"تم... تم"۔ جھنجھلایا جھنجھلایا سا ایک ملازم کبھی اُسے اور کبھی وین کو دیکھ رہا تھا۔ عبداللہ کی بجائے ایک لڑکی دیکھ کر وہ زیادہ بول بھی نہ سکا۔

"نئی لگتی ہے یہاں"۔ دوسرا ملازم بولا۔

"اتنا شور مچانے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا تمہیں معلوم نہیں اس وقت مالک سو رہے ہوتے ہیں"۔

پہلا ملازم گھبرا گھبرا کر اوپر کی ایک خاص بالکنی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہ کوئی سونے کا وقت ہے"۔ وہ بے نیازی سے بولی۔ "اور پھر تم اتنا ڈرتے کیوں ہو؟"

"اُسے یاد آیا وہ بھی اپنے گھر میں اسی طرح دیر تک سویا کرتی تھی۔ اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ شور کرتا اور اُسے جگاتا۔

مگر۔۔۔ اس وقت جانے کیوں اُسے مالک کا یہ انداز اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اپنی تشنگی کا رد عمل تھا شاید۔

اور پھر۔۔۔ اُس نے دیکھا۔ نائیٹ گاؤن کی ڈوری باندھتا کوئی اُسی مخصوص بالکنی میں آ کھڑا ہوا تھا۔

یہ تو۔۔۔ وہی تھا۔۔۔ شیر شاہ۔

ایک پل کو اُس کی آنکھوں میں قندیلیں سی جل اٹھیں۔

وہ جلدی سے آگے بڑھی۔

"مالک تو مالک ہے آپ کیوں سو رہے تھے اب تک؟" اُس کے الجھے بال، نیم وا بھاری

آنکھیں دیکھ کر اُس نے نیچے سے ہانک لگائی۔

ایک گہری سانس لیتے ہوئے۔۔۔ وہ خوبصورتی سے ہنس دیا۔

"آتا ہوں"۔ اُس نے کہا۔ اور پلٹ کر اندر غائب ہو گیا۔

وہ وہیں کھڑی رہی۔۔۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتی رہی۔

کیا ذوق تھا مالک کا۔ مخملیں لان کتنے خوبصورت تھے۔ کیاریوں میں نادر اقسام کے گلاب لگے تھے۔ اونچے ستونوں سے سفید پھولوں سے اٹی بیلیں لپٹی تھیں۔ بالکنیوں میں سے سیاہی مائل سُرخ ان گنت پھول جھول رہے تھے۔

تبھی۔۔۔ تھوڑی دیر قبل والے دو ملازموں میں ایک اس کے قریب چلا آیا۔

"آپ کو صاحب نے یاد کیا ہے"۔ اب کے وہ بہت مؤدب طریق سے بولا۔

اور۔۔۔ وہ اس کی راہنمائی میں کوٹھی کے پچھواڑے بڑھی۔

اب وہ نیچی سی ڈھلان اُتر رہی تھی۔ جہاں جگہ صاف کر کے عمدہ گھاس لگوائی گئی تھی۔ جا بجا نایاب پھولوں کی کیاریاں تھیں، جگہ جگہ گھنے چوڑے پتوں والے درخت تھے، نوخیز جھاڑیوں کو تراش کر خوبصورت شکلوں میں ڈھالا گیا تھا۔ بائیں جانب ایک خوبصورت جھونپڑی نما چھپر چھوٹے سرخ پھولوں والی بیل سے ڈھکی تھی، وہیں بیٹھنے کے لئے چند بید کی کرسیاں بھی رکھی تھیں۔

اس انوکھے حُسن سے مسحور وہ آگے بڑھی۔

اب۔۔۔ پتھر کی سلیٹوں کی بنی چند سیڑھیاں تھیں۔ وہ اُتر کر نیچے آ گئی۔

یہاں۔۔۔ اونچے اونچے پام کے درخت تھے، اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے۔۔۔ شفاف چمکتی ریت تھی۔ اور دو چار قدم کے فاصلے پر۔ دُور تک پھیلا سمندر کا نیلگوں پانی۔

"صاحب سامنے تشریف رکھتے ہیں"۔ ملازم کی آواز پر چونک کر اُس نے اُس طرف

دیکھا۔

پام کے درختوں کے بیچ، ساحل کی چمکتی ریت پر، پام کے سوکھے پتوں کی بنی چھتری کے نیچے، کین کی کرسی پر بیٹھا کین ہی کی میز پر ننگے پیر سیدھے پھیلائے وہ نیلے پانیوں پر نظریں جمائے تھا۔

ملازم اُسے اُس کے پاس پہنچا کر واپس پلٹا۔

''ہیلو''۔ میز پر سے ٹانگیں سمیٹتے ہوئے اُس نے خوشگواری سے کہا۔

''ہیلو''۔

''بیٹھو''۔ اُس نے اپنے مقابل والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں بیٹھوں گی نہیں بڑا کام پڑا ہے''۔ وہ کھڑے کھڑے بولی۔

اور ـــ وہ چڑ سا گیا۔

''میں نے پہلے بھی کہا تھا۔ اس کام کیلئے ملازم رکھا جا سکتا ہے''۔

''میں نے بھی کہا تھا پھپھو دوسرا ملازم AFFORD نہیں کر سکتیں''۔

''اُفوہ''۔ وہ جھنجھلا اُٹھا۔ ''بیٹھو''۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر اُسے ہاتھ سے پکڑتے ہوئے زبردستی بٹھا لیا۔

چیں بچیں ہوتے ہوئے اُس نے اپنی گھڑی پر نگاہ کی۔

''دوسرے کی موجودگی میں گھڑی نہیں دیکھتے ہوتے''۔ اس کے لہجے میں تنبیہہ سی تھی۔

چونک کر وہ اُسے دیکھنے لگی۔

''آپ ـــ آپ مجھے ڈانٹ رہے ہیں''۔ وہ اٹھنے کو ہوگئی۔

اوہ ـــ وہ تو بچوں کی طرح ناراض لگ رہی تھی۔ بسورتی ہوئی شکل، روٹھا روٹھا لہجہ۔

''سوری ـــ میرا یہ مطلب نہیں تھا''۔ وہ اپنی نادانستہ کرختگی پر نادم نظر آ رہا تھا۔

''میں تو اتنی تعریف کر رہی تھی آپ کی پھپھو کے سامنے اور آپ ہیں کہ ...''۔ وہ میز پر انگلی سے لکیریں بنا رہی تھی۔

''کیا کہا تھا اُن سے؟'' مدھر مسکراہٹ ہونٹوں پر لئے وہ دلچسپی سے اُس کی جھکی پلکوں کو دیکھ رہا تھا۔

''کچھ نہیں''۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کہاں؟'' ہاتھ سے پکڑتے ہوئے وہ اُسے اپنی کرسی کے قریب لے آیا۔

''کام پر''۔ وہ دور تک پھیلے نیلگوں پانیوں کو تکتے ہوئے بولی۔

''آئندہ کام کا ذکر کیا تا...''۔

''آپ پھر ڈانٹ رہے ہیں مجھے ...''۔ ہنوز نظریں پانی پر جمائے اُسی روٹھے روٹھے لہجے میں اُس نے جیسے یاد دہانی کرائی۔

''اوہ ـــ اچھا بابا آئندہ ایسا نہیں ہوگا''۔

پانی سے نظریں ہٹا کر وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

گلابی، سُرخ، نسواری ـــ شوخ، چمکیلے، روشن رنگ آپس میں گڈمڈ ہوتے اُس پر مرکوز تھے۔

وہ مسحور سی اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

یہی تو رنگ تھے جو ـــ کل سے برابر اس کا محاصرہ کئے تھے۔

یہی تو آنکھیں تھیں جن کی ـــ رات اُس نے بے شمار تصویریں بنا ڈالی تھیں۔

وہ معصومیت سے مسکرادی۔ سادگی سے ہنس دی۔

''رات دیر تک میں آپ کی آنکھوں کے سکیچ بناتی رہی تھی''۔

وہ ـــ چونک سا گیا۔

''سونے کی کوشش کرتی تھی مگر بار بار آپ کی آنکھیں سامنے آ جاتی تھیں۔ سونے ہی نہیں دے رہی تھیں...''۔

اور ___ شوخ، چمکیلے، روشن رنگ دمک اُٹھے۔

پرکشش ہونٹوں پر شریر تبسم مچلنے لگا۔

''صبح آنکھ کھلی تو پہلا خیال پھر...''۔ اُس کی آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے وہ چُپ ہو گئی۔

اس کی آنکھوں کی دمک جیسے کچھ کہہ رہی تھی۔ ہونٹوں کا شریر تبسم جیسے کچھ سمجھا رہا تھا۔

جانے کیوں؟ وہ بدحواس سی ہو گئی۔ رُخ جلدی سے دوسری طرف کر لیا۔

وہ ہولے سے مسکرا دیا۔ دھیمی، دلنشین مسکراہٹ۔

''بیٹھو''۔ وہ اب بھی اس کا ہاتھ پکڑے تھا۔

''میں ___ چلتی ہوں''۔ ہنوز رُخ پھیرے اس نے ہاتھ چھڑانا چاہا۔

''نہیں''۔ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ اُسے پھر اپنے مقابل کی کرسی بٹھا لیا۔ پہلے تم میرے ساتھ ناشتہ کرو گی ___ پھر بیچ کی سیر کریں گے...''۔

''اور ___ وہ پولٹری''۔ اب اس کے لہجے میں بھی وہ پہلے والی تیزی نہ رہی تھی۔

اور ___ اُس نے گہری تھکی سانس لی۔

''اس کا بندوبست ہو گیا ہے۔ ڈرائیور پولٹری دینے جا چکا ہو گا اب تک''۔

اور ___ سے بیٹھنا ہی پڑا۔

مشعل نے محسوس کیا۔ وہ اچانک بدل سی گئی تھی، ساری شوخی ماند پڑ گئی تھی۔ اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اُس سے نظریں چُرا رہی تھی جیسے۔

اُس نے ٹانگیں میز کے نیچے سیدھی پھیلا لیں، سر کرسی کی پُشت سے ٹکا لیا اور ___ دلنشین آنکھیں موند لیں۔

ہلکی نیلی زمین پر تیز نیلی ان گنت اڑتی پھرتی تتلیوں والے کپڑے پہننے والی ___ تتلی ___ اس وقت اپنے کپڑوں کی تتلیوں کی طرح اڑتی نہیں پھر رہی تھی۔

چپ چپ سی تھی، خجل سی۔

ایک بار پھر ___ مدھری مسکراہٹ اس کے لبوں کو چُھو گئی۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ ___ اُسے ہی دیکھ رہی تھی ___ مگر ___

اس کے آنکھیں کھولتے ہی ___ سرخ سی ہوتے ہوئے ___ سیاہ گھنے بالوں کی بے ترتیب لٹ ماتھے پر سے ہٹاتی۔

دُور پانیوں کے اُس پار ___ سرسبز جزیرے کو دیکھنے لگی۔

وہ ___ ہنس دیا ___ دھیرے سے۔

اوپر نگاہ کی۔ شفاف آکاش پر بگلے سے سفید بادل کا آوارہ ٹکڑا اِدھر اُدھر منڈلا رہا تھا۔

اردگرد دیکھا۔ قریب ہی گیلی چمکتی ریت پر ایک سبک اندام سی گل خراماں خراماں چہل قدمی کر رہی تھی، ہوا کے مدھر جھونکوں میں نوخیز ہریالی کی مسحورکن مہک تھی۔ اور پاس سے ہی ___ ماہی گیروں کی ایک کشتی دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔

تبھی سفید یونیفارم میں ملبوس بیرا ناشتے کی ٹرے لئے آ پہنچا۔

میز پر برتن رکھنے کے بعد خالی ٹرے لئے وہ واپس چل دیا۔

''شروع کرو''۔ شیر شاہ سیدھا بیٹھتے ہوئے بولا۔

مشعل نے ناشتہ پر نگاہ کی۔

جوس تھا، آملیٹ تھی، اُبلے انڈے، سیب...

اُس نے ایک سیب اُٹھا کر کھانا شروع کر دیا۔

"یہ سب تمہارے لئے ہے"۔ اُس نے ناشتہ کی طرف اشارہ کیا"۔ میں تو صرف جوس اور اُبلا انڈا لوں گا"۔ اُس نے جوس کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

"میں ناشتہ کر کے آئی ہوں"۔ وہ اب بھی سیب کھا رہی تھی۔

"کچھ کھا لو ورنہ ہمارا کک ناراض ہو جائے گا"۔ وہ خوشگواری سے بولا۔

وہ بھی ہنس دی۔ وہ اب تک کچھ سنبھل چکی تھی۔

"چائے؟" شیر شاہ نے پوچھا۔

"نہیں"۔ اُس نے سر نفی میں ہلایا۔

"کوفی؟"

اور ـــ اُس نے پھر سر انکار میں ہلا دیا۔

"اچھا تم دودھ پی لو"۔ وہ کپ میں دودھ ڈالنے لگا۔

اور ـــ مشعل خوشی خوشی دودھ پینے لگی۔ گھر میں بھی تو وہ دودھ ہی لیا کرتی تھی۔ چائے تو کبھی پی ہی نہ تھی۔

اُس کی ہر بات، ہر ادا میں بچوں کی سی معصومیت تھی۔

وہ محظوظ سا ناشتہ کرتے کرتے اُسے دیکھتا گیا۔

"رات میری آنکھوں کے سکیچ بنانے کا خیال کیسے آیا؟" کوفی کا کپ منہ سے لگاتے ہوئے وہ اپنی مسکراہٹ صاف چھپا گیا۔

اُس کے معصوم چہرے پر رنگ سا دوڑ گیا۔

"تم کہتی تھیں تمہیں سونے نہیں دے رہی تھیں"۔

اس کی خمیدہ پلکیں کانپ گئیں۔

"پتہ نہیں"۔

"میری آنکھیں زیادہ ڈراؤنی تو نہیں"۔ اُسے چھیڑنے میں اُسے مزا آ رہا تھا۔

"آپ چپ نہیں رہ سکتے"۔

"اوہ"۔ وہ خوبصورتی سے ہنس دیا۔ "اب نہیں بولوں گا"۔

کچھ دیر قبل یہی سب کچھ اُس نے خود ہی تو اُسے بتایا تھا۔

کتنی معصومیت سے، کتنی سادگی سے۔

اب شاید ـــ آگاہ ہوئی تھی، محتاط ہو رہی تھی۔

"وہ ـــ مالک سو رہا ہے اب تک؟" ایک بار پھر مشعل نے دُور جاتی کشتی پر نظریں جما دی تھیں۔

"بڑی جلدی خیال آیا"۔

"کیا بوگس آدمی ہے"۔ وہ نخوت سے بولی۔ "اتنے خوبصورت جزیرے کا مالک ہے۔ کبھی باہر نکل کر دیکھتا ہی نہیں شاید..."۔

"دراصل ـــ اُس کی ایک ٹانگ میں نقص ہے۔ نہیں چاہتا ہوگا کہ ـــ" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ "اتنی خوبصورت لڑکی اُسے لنگڑاتے دیکھے..."۔

"اوہ"۔ وہ یکدم سنجیدہ نظر آنے لگی۔ "تو آپ نے اُس کے پاس بیٹھ کر ناشتہ کیوں نہیں کیا"۔

"تم جو آدھمکی تھیں طوفانِ بادوباراں کی طرح"۔

اور ـــ وہ خوبصورتی سے ہنسنے لگی۔

اس کی ہنسی کی نازک سی کھنک، اس کے موتیوں جیسے خوبصورت دانت ـــ بہت بھلے لگ رہے تھے۔

"چلو میم"۔ اُس نے نیپکن سے ہاتھ پونچھے۔ پینٹ کے پائینچے قدرے اوپر کی طرف

لپیٹے۔اور ننگے پاؤں ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

مشعل نے دیکھا۔تھوڑی سی ہی دیر میں ڈریس اپ ہوا___ بیج کلر کی پینٹ، ہمرنگ قمیض میں وہ بہت سمارٹ لگ رہا تھا۔

اُس کی مخصوص مدھر پرفیوم کی مہک مسحور کن تھی۔اُس کے آس پاس کی فضا میں اس کی شخصیت کا دبدبہ بول رہا تھا۔

''تم بھی شوز اتارلو۔گیلی ریت پر ننگے پاؤں چلو گی تو مزا آئیگا''۔

اور ___شوز اتار کر وہ اس کے ساتھ ہولی۔

ایک جوان آدمی کے ساتھ یوں تنہائی میں گھومنا پھرنا کسی اندیشے کا باعث بھی ہوسکتا ہے یہ تو وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔کہ اس کی تربیت ہی کچھ ادھوری سی ہوئی تھی۔

مگر___اس کے کہنے پر اس کے ساتھ چل پڑنے پر وہ تیار ہوجاتی تھی___ یہ خلاف معمول ضرور تھا۔

ایسا اس سے قبل اُس نے کبھی نہیں کیا تھا۔وہ پھپھو کا جاننے والا تھا،اُس سے بہت بڑا بھی تھا، جو کہتا تھا شاید ٹھیک کہتا تھا___ اسی لئے غالباً وہ اُس کی ہر بات مان لیتی تھی۔

وہ ٹھنڈی،نم ریت پر اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

دائیں طرف. دور تک سمندر کا شفاف نیلگوں پانی تھا___اور ساحل پر ___سفید چمکتی ریت، پام کے اونچے درخت، اُن کے عقب میں نوخیز جنگلوں کی گھنیری جھاڑیاں___ نیم تاریک پُراسرار ماحول!

''وہ دُور جو سبز لکیر سی نظر آرہی ہے نا''۔وہ دُور اُس پار اشارہ کرتے ہوئے اُسے بتانے لگا۔''یہ دراصل اسی جیسا دوسرا جزیرہ ہے۔مگر اُس پر کوئی آباد نہیں۔یہاں تمہیں بیشتر جزیرے خالی نظر آئیں گے۔ساحل کی ریت سے کچھ فاصلے پر کسی کے قدموں کے نشان دکھائی دیں گے تو

تھوڑی دیر بعد احساس ہوگا کہ یہ تو اپنے ہی قدموں کے نشان تھے۔بالکل ایسے جیسے روبنسن کروسو کے خالق ڈینئیل ڈیفو کو نظر آئے تھے...''۔وہ بہت دلکش انداز میں اُسے بتا رہا تھا۔

مشعل دلچسپی سے کبھی اُسے اور کبھی اُس پار جزیرے کو دیکھ رہی تھی۔

''لیکن ہر جزیرہ ایسا نہیں ہے''۔وہ پھر کہنے لگا۔''کوئی جزیرہ تمہیں زندگی کی رونقوں سے پُر بھی نظر آئے گا۔وہاں ماہی گیروں کی بستی ہوگی، ساحل پر جدید طرز کی کشتیاں کھڑی ہوں گی۔اور اگر وہ تفریحی جزیرہ ہے تو وہاں چھٹیاں گزارنے والے لوگوں کا ہجوم ہوگا...''۔

اُسے خاصی معلومات تھیں ان جزیروں کے متعلق۔مشعل انہماک سے سُن رہی تھی۔

''کسی جزیرے پر کارخانوں اور فیکٹریوں کی چمنیوں سے اٹھتا دھواں یہاں کی صنعتی زندگی کا ثبوت دیتا نظر آئے گا۔یا جہازوں کی آمدورفت کسی انٹرنیشنل ایئرپورٹ کی موجودگی کا پتہ دے گی...''۔

اُس کا لہجہ دلنشین انداز بیان بہت دلکش تھا۔

''یہ سب ہے ___ مگر اِس کے باوجود مجھے غیر آباد جزیرے ہمیشہ اچھے لگے ہیں۔ایک بات ہے ان میں''۔وہ پام کے دُور تک جُھکے ہوئے ایک تنے کے نیچے سے جھکتے ہوئے نکل کر پھر کہنے لگا۔ ''یہ غیر آباد سہی یہاں بھوکا پیاسا کوئی نہیں مرتا۔اگر صاف پانی کا کوئی تالاب نہ ہو تو زمین میں چند فٹ کی گہرائی پر پانی مل جاتا ہے۔یا پھر ایک تازہ ناریل پیاس اور تھکن دُور کر دیتا ہے،بھوک لگے تو سمندر سے ہاتھ بڑھا کر مچھلی پکڑی جاسکتی ہے''۔

''اس طرح'' ___ قریب ہی پانی میں تیرتا پام کا بڑا سا گیلا پتا اٹھا کر مشعل نے اس کی شفاف قمیض کی طرف اچھالا اور ___

بھاگی واپس ___ اُسے بہرحال واپس جانے کی فکر تھی۔

''یو...''۔اُس نے دو ہی قدم پر اُسے جالیا۔دیکھو میری قمیض''۔اُسے بالوں سے پکڑ کر

اس نے اس کا رُخ اپنی طرف کر لیا۔

مشعل نے پہلے اُس کی گیلی ریت میں لت پت ہوئی قمیض اور پھر ___ اُس کی طرف دیکھا۔

وہ تو ___ سنجیدہ تھا۔ غور سے دیکھ رہا تھا اُسے۔

اس کی چمکتی نیلی آنکھیں پھیل سی گئیں۔ خوفزدہ سی ہو گئی وہ۔

"صاف کرو اِسے"۔ اُس کے لہجے میں تحکم تھا۔

اور ___ وہ خوف بھول بھال گئی۔

"میں صاف کروں گی؟"

"ہاں ___ تم صاف کرو گی"۔

مشعل کے چہرے کا رنگ بدل سا گیا۔ ہاتھ مار کر اپنے بال چھڑائے۔ اور اکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

ہاتھ بڑھا کر شیر شاہ نے اُس کا ہاتھ پکڑا۔ اور باوجود اُس کے احتجاج کے اس کی آنکھوں میں دیکھ دیکھ کر ___ اُسی کے ہاتھ سے اپنی قمیض جھاڑنے لگا۔

اور ___ مشعل نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتی واپس جانے لگی۔

وہ بھی ___ پیچھے پیچھے آنے لگا۔

جب مشعل نے پام کا گیلا پتا اُس پر پھینکا تھا، وہ ایک پل کو چونکا ضرور تھا، ایسا کرنے کی اس سے قبل کسی کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

مگر دوسرے ہی لمحے جانے کیوں اُسے اُس کی بچوں کی سی یہ حرکت اچھی سی لگی تھی۔ وہ جان بوجھ کر سنجیدہ بنا تھا۔

جب وہ خوفزدہ ہوئی تھی۔ تو وہ محظوظ ہوا تھا۔ اُسے قمیض صاف کرنے کو کہتے وقت وہ اپنی

مسکراہٹ بڑی خوبصورتی سے چھپا رہا تھا۔

جب وہ اکڑ گئی تھی تو اُسے اور بھی اچھا لگا تھا۔

اور ___ جب باوجود اُس کے احتجاج کے وہ اُسی کے ہاتھ سے اپنی قمیض جھاڑ رہا تھا تو اُس کی آنکھوں میں دیکھ دیکھ کر اُس نے اپنی ہنسی ___ بمشکل روک رکھی تھی۔

اُس نے دیکھا ___ نیچے ریت پر بیٹھی ___ وہ اپنے شوز پہن رہی تھی۔

شاید ناراض تھی، خفا تھی، بہت سخت۔ غصّے غصّے میں تسمے باندھ رہی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" اُسے کوٹھی کی طرف جاتے دیکھتے وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔ چند قدم آگے بڑھ آیا۔

"گھر"۔ وہ پھولے پھولے منہ کے ساتھ بولی۔

"میں چھوڑ آتا ہوں"۔

"میں خود جا سکتی ہوں"۔ آگے نکلتے ہوئے وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔

اور ___ شیر شاہ کی نظر کوٹھی کے موڑ پر کھڑے ملازم پر پڑی۔

وہ ___ محتاط سا ہو گیا۔ بڑے بڑے قدم اٹھاتا مخالف سمت چل دیا۔

مشعل کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکل کر ___ پیدل ہی چل پڑی۔

"آؤ"۔

چونک کر اس نے سر اٹھایا۔

شیر شاہ تھا ___ گاڑی لئے کوٹھی کے باہر اس کا منتظر کھڑا تھا۔

"نہیں"۔ اس کا منہ اب بھی پھولا پھولا تھا۔

"کیسے نہیں"۔ وہ باہر نکلا۔ اُسے ہاتھ سے پکڑا اور سامنے سے گھوم کر اُسے اگلی سیٹ پر لے آیا۔

دروازہ بند کیا ۔۔۔ اور گاڑی چلا دی۔

"خفا ہو؟" قدرے توقف کے بعد کھڑکی سے باہر دیکھتی مشعل پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اُس نے کہا۔

وہ کچھ نہیں بولی۔ اور بھی کھڑکی کی طرف سرک گئی۔

"اوہ"۔ وہ خوبصورتی سے مسکرایا۔ "تم تو بہت خفا ہو"۔

"میں بالکل خفا نہیں ہوں"۔ باہر ہی دیکھتے وہ جیسے کاٹ کھانے کو دوڑی۔

"پھر ۔۔۔ غصہ ہو؟"

"ہاں"۔ اُس نے رُخ اس کی طرف کر لیا۔ "آپ اپنے آپ کو اتنی اونچی چیز کیوں سمجھتے ہیں"۔ وہ پھٹ ہی پڑی۔

وہ ۔۔۔ پھر مسکرا دیا۔ وہی مخصوص، دھیمی مسکراہٹ۔

"ایسی بات نہیں ہے"۔ وہ نرمی سے بولا۔

وہ محسوس کر رہا تھا وہ اُس کی ہر بات بڑی فراخدلی سے سہہ رہا تھا۔ لڑتی بھڑکتی یہ چھوٹی سی لڑکی اُسے اچھی لگ رہی تھی۔

"آؤ صلح کر لیتے ہیں"۔ اُس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

"نہیں"۔ اپنے دونوں ہاتھ اُس نے اپنے پیچھے کر لئے۔

وہ ۔۔۔ ہنس دیا ۔۔۔ دھیرے سے۔

پھر ۔۔۔ سامنے راستے پر نظریں جما دیں۔

"بات کرو نا"۔ قدرے توقف کے بعد وہ پھر بولا۔

"نہیں۔ میں اب بھی خفا ہوں"۔ وہ بہت سنجیدہ تھی۔

اور ۔۔۔ شیر شاہ کا ایک جاندار قہقہہ گونجا۔

"میں نے قمیض صاف کروائی؟"

اور ۔۔۔ اس نے ایک خشمگیں نظر اُس پر ڈالی۔

"باپ رے۔ تم تو واقعی خفا ہو"۔

"تو آپ اب تک مذاق سمجھ رہے تھے"۔ وہ گویا اور بھی ناراض ہو گئی۔

وہ چند لمحے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کی معصومیت کو جانچتا رہا۔

پھر ۔۔۔ دوبارہ سامنے دیکھنے لگا۔

"اگر ۔۔۔ قمیض صاف ہو گئی تو اس میں کیا بُرائی ہے"۔ اُسے تنگ کرنے میں جیسے اُسے مزا آ رہا تھا۔

"قمیض خود بخود صاف نہیں ہوئی"۔

"تو؟"

"تو ۔۔۔ تو" ۔۔۔ اور اُس کی باتوں کے ہیر پھیر میں آ کر اُسے اور بھی غصہ آ گیا۔

"اے"۔ ہاتھ بڑھا کر اُس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا"۔ میں تم سے بڑا بھی تو ہوں،

اگر تم نے قمیص صاف کر دی تو کیا ہوا...."۔

اور ۔۔۔ جیسے بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

"ہاں ۔۔۔ ایسا کہیں نا"۔

اور ۔۔۔ اُس نے ایک گہری سانس لی۔

"تم کیا چیز ہو"۔

"میں چیز نہیں ہوں"۔ وہ پھر تیز ہونے لگی۔

"پھر کیا ہو"۔

"میں ۔۔۔ مشعل ہوں"۔

"اچھا بابا"۔ تھکی تھکی سی سانس لیتے ہوئے اس نے گاڑی پھپھو کے مکان کے آگے روک لی۔

"آپ نے جگایا کیوں نہیں پھپھو"۔ مشعل ناشتے کی میز پر پراٹھے کے ساتھ آملیٹ کھاتے ہوئے کہنے لگی۔ "کام کی بھی دیر ہو رہی ہے"۔

"میں نے جان کر نہیں جگایا۔ دراصل آج صبح ہی صبح مالک نے آدمی بھیج دیا تھا، کہتا تھا آج سے وہ ہی پولٹری دینے جائیگا..."۔

مشعل ناشتہ کرتے کرتے رُک گئی۔ بدحواس سی نظر آنے لگی۔

وین چلانا اور پولٹری تقسیم کرنا ۔۔۔ محبوب ترین مشاغل تھے جیسے اُس کے۔ اسی بہانے تو وہ روز پورے جزیرے کا چکر کاٹ کر آتی تھی۔

"میں نے بہتیرا کہا عبداللہ اب ٹھیک ہے، دو ایک دن میں کام شروع کر دے گا۔ مگر مالک کا حکم پھر مالک کا حکم ہے..."۔ پھپھو اطمینان سے کہتی گئیں۔

"پھپھو۔ بس ہم خود کریں گے اپنا کام۔ مالک کا اس میں کیا ہے"۔ وہ جھنجھلائی جھنجھلائی سی پھر سے ناشتہ کرنے لگی۔

"میں نے کہہ تو دیا ہے آج بے شک اُن کا آدمی کرلے مگر بعد میں پھر عبداللہ ہی جائے گا"۔

"عبداللہ نہیں ۔۔۔ میں"۔

اور پھپھو شفقت سے مسکرادیں۔

اُس کی بچوں کی سی ضد وہ سمجھتی تھیں۔ گھر میں سارا دن بیٹھے رہنا ظاہر ہے کوفت ہوتی تھی اسے اور پھر وہ بھی تو سارا دن مرغیوں کی دیکھ بھال اور گھر کے کاموں میں مصروف رہتی تھیں۔ بور تو ہونا تھا اُسے۔

''جیسی تمہاری مرضی بیٹے''۔ انہوں نے مکمل ہتھیار ڈال دیئے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر مشعل کل کے نکلے ہوئے نوزائیدہ چوزوں کے پاس پہنچ گئی۔ روئی کے گالوں کی طرح نرم وگرم سفید سفید ننھے منے سے چوزے ___ وہ وہیں ان کے پاس بیٹھ رہی۔

تبھی ___ پھپھو وہاں آتی دکھائی دیں۔

سر میں خوب سارا تیل چپڑے، آنکھوں میں ڈھیر سارا سرمہ لگائے۔ اب بھی ہاتھوں میں تیل کی شیشی، سرمہ دانی اور لکڑی کی دوطرفہ دندانوں والی کنگھی پکڑے چلی آ رہی تھیں۔

''تیل نہ لگاؤں سر میں تو مُوا دماغ کام نہیں کرتا، سرمہ نہ ڈالوں آنکھوں میں''۔ وہ اُس کے پاس ہی گھاس پر بیٹھ گئیں۔ ''تو پہاڑ تک نظر نہیں آتا''۔

پھپھو کی باتیں اُسے بہت اچھی لگتی تھیں۔ ننھے سے چوزے کو گال سے محسوس کرتے ہوئے وہ ہنس دی۔

پھپھو نے تیل، سرمہ اور کنگھی پاس رکھے، مشعل کو اپنے دونوں گھٹنوں میں جکڑا۔ اور ہتھیلی میں ڈھیر سارا تیل لے کر ___ داغ دیا اُس کی چندیا پر۔

''یہ کیا کر رہی ہیں پھپھو''۔ مشعل نے احتجاج کیا۔ اُسے تیل لگانا اچھا نہیں لگتا تھا۔

''اے چپ''۔ وہ اس کے بال بال میں تیل لگانے لگیں۔ ''جب سے آئی ہو تیل کی شکل نہیں دیکھی۔ حال دیکھا ہے اپنے بالوں کا۔ میں تو حیران ہوں تمہیں بات کیسے یاد رہ جاتی ہے بغیر تیل لگائے...''۔

اوہ ___ تو پھپھو کو واقعی اتنا عقیدہ تھا تیل چپڑنے کے بارے میں۔

''لیکن میں یہ اتاروں گی کیسے۔ اتنا تیل تو کوئی بھی شیمپو صاف نہیں کر سکتا''۔ اس کا احتجاج اب بھی اپنی جگہ تھا۔

''اے تم اسے اتارو گی کیوں؟'' اب وہ زور زور سے اُس کے سر میں مالش کر رہی تھیں۔

''ابھی تو کچھ دن رکھو گی اسی طرح جب تک اچھی طرح دماغ میں اُتر نہیں جاتا''۔

واہ ___ مشعل نہ چاہتے ہوئے بھی کھلکھلا کر ہنس دی۔

''دماغ میں اُترنے کے بعد کیا ہو گا؟'' اُن کی باتوں کے ساتھ ساتھ مشعل کو اب مالش میں بھی مزا آ رہا تھا۔

''اب بناؤ نہیں مجھے، پتہ ہے تمہیں دماغ کے اندر جا کر ہر نس کو چکنا کر دیتا ہے۔ اور پھر حافظہ چمک اٹھتا ہے...''۔

اُن کی منطق پر وہ کھلکھلا کھلکھلا کر ہنستی رہی۔

کنگھی لے کر پھپھو نے اچھی طرح اُس کے مُنے سے بالوں میں کنگھی کی۔

پھر کنگھی رکھ کر ___ سُرمہ دانی اٹھائی۔

''لاؤ اب سُرمہ لگا دوں''۔ ساتھ ہی انہوں نے اس کی ایک آنکھ میں سرمے بھری سلائی پھیر دی۔

وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

انہوں نے پوری تین تین سلائیاں اس کی آنکھوں میں پھیریں۔

اور پھر۔ اپنا سامان سمیٹ کر چلتی بنیں۔

مشعل پھر چوزوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

تبھی ___ دروازے پر دستک ہوئی۔

اور تھوڑی ہی دیر بعد ___ پھپھو دو لفافے ہاتھ میں لئے آتی دکھائی دیں۔

"تمہارے خط ہیں بیٹا"۔

وہ سب چھوڑ چھاڑ لپک کر پاس چلی آئی۔

خطوط اُن سے لئے۔ اور قریبی درخت کے سائے میں رکھی کرسی پر بیٹھ کر دیکھنے لگی۔ پھپھو واپس چل دیں۔

اُس نے ایک لفافہ کھولا، بیرسٹر انکل کا تھا۔ دوسرا رحمت بابا کا۔

بیرسٹر انکل کا خط شفقت بھرا تھا، تسلی بھرا تھا۔ لکھا تھا آج کل وہ پاپا کے کئی چھوٹے بڑے مقدموں کی جانچ پڑتال میں مصروف تھے۔ آنٹی نے بھی اُسے دعائیں اور پیار بھیجا تھا، دونوں نے اپنا خیال رکھنے کو کہا تھا۔

پر ___ جانے کیا تھا رحمت بابا کے خط میں ___ شروع کرتے ہی اس کا دل بھر آیا، گھٹنوں پر سر رکھ کر بے اختیار رو دی۔ ان کا خط وہیں سے لکھا گیا تھا جہاں وہ رہا کرتی تھی، اُسی ماحول میں، اُسی فضا میں۔ کتنا سکون تھا وہاں، کتنی خوشیاں تھیں۔ پھر ___ اچانک سب ختم ہو گیا۔ سکون درہم برہم ہو گیا، خوشیاں روٹھ گئیں۔

اس نے سر اٹھایا، آنسو پونچھے، آگے پڑھنے لگی۔ لکھا تھا۔

...وہ اور باقی ملازمین اب تک وہیں تھے، اپنی اپنی جگہوں پر، اپنی اپنی ڈیوٹی پر۔ مسٹر خان نے خود آ کر انہیں تنخواہیں دی تھیں، بہت مہربانی سے پیش آئے تھے۔ کہتے تھے یہ گھر اب بھی تم لوگوں کا ہے۔ اسے اپنا سمجھو اور اس کا خیال رکھو۔ وہ تو یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ آپ ملک سے باہر جائیں۔ اسی سلسلے میں وہ آپ سے ملنا بھی چاہتے تھے مگر آپ نے انکار کر دیا ملنے سے۔ وہ کہتے تھے یہ کوٹھی اور یہاں کی ہر چیز مشعل بی بی کی ہی ہے۔ میں تو صرف رکھوالی کرنا چاہتا ہوں ان کی بھی اور کوٹھی کی بھی...

اور ___ مسٹر خان کی یہ چکنی چپڑی باتیں وہ مزید برداشت نہ کر سکی۔ خط توڑ مروڑ کر اُس نے وہیں ڈال دیا۔

اور ___ پریشان اور اداس سوچوں میں کھوئی ___ وہ کچن کے آگے لگی سبزی توڑنے لگی۔

قریب ہی پھپھو کنوئیں سے پانی نکال رہی تھیں۔

"کس کے خط تھے بیٹے"۔ وہ وہیں سے بولیں۔

"ایک بیرسٹر انکل کا ہے اور دوسرا رحمت بابا کا"۔

"سب خیریت تو ہے نا"۔

"ہاں ___ بس..."۔

"رحمت بھیا نے کیا لکھا ہے؟" رحمت بابا مشعل کے دادا کے وقتوں کے ملازم تھے اور پھپھو بھی اُن سے واقف تھیں۔

"اتنی عمر ہو گئی اُن کی مگر اب تک دوست اور دشمن میں فرق کرنا نہیں آیا اُنہیں"۔

"اُن کی عقل کے تو تب بھی بڑے چرچے تھے"۔ پھپھو بے اختیار ہنستے ہوئے بولیں۔

"کیا لکھا ہے؟"

"جس آدمی کے پاس ہم لوگوں کی کوٹھی گروی ہے اس کی اتنی تعریفیں لکھی ہیں..."۔

"اے تو کیا خبر اچھا ہی آدمی ہو"۔ بالٹی بھر کر وہ کچن کی طرف آنے لگیں۔

"آپ نہیں جانتیں پھپھو وہ کس قدر گھٹیا انسان ہے"۔ اس کے لہجے میں نفرت اپنے انتہا پر تھی۔ "عیاری کی انتہا دیکھیں کہ اب تک سب ملازموں کو اپنی اپنی جگہ رکھا ہوا ہے۔ تنخواہیں دے رہا ہے اور کہتا ہے کہ یہ گھر اب بھی تم لوگوں کا ہے۔ میں تو صرف رکھوالی کر رہا ہوں..."۔

اس کا چہرہ مجروح اور آنکھوں میں کرب تھا۔

ایسی حالت میں پھپھو نے اُسے اس سے قبل نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو اڑتی پھرتی معصوم پنچھی

کی مانند ہوا کرتی تھی۔ شروع شروع میں ایک دو بار اُداس ضرور ہوئی تھی۔ مگر اُن کی تسلیوں اور خوش رہا کرنے کی تاکیدوں سے وہ خاصی بہل گئی تھی۔ خوش بھی رہتی تھی۔

آج رحمت بابا کا خط پا کر ایک بار پھر وہ اداس اور غمگین لگ رہی تھی۔ آنکھیں جیسے انتقام کی آگ سے سلگ رہی تھیں۔

اور ـــــ یہ قدرتی بھی تھا۔ کوئی اچانک آ کر گھر بار چھین لے، دل جلتا تو ہے۔ گو کوٹھی خود ذوالفقار علی نے گروی رکھوائی تھی، اُسے یہاں بھیجا بھی انہیں کی وصیت پر گیا تھا۔ پر ـــــ گھر چھن تو گیا تھا۔ وہ دربدر ہونے پر مجبور تو ہوئی تھی۔

ایک ٹھنڈی آہ اُن کے لبوں پر آ کر دم توڑ گئی۔

بالٹی وہیں رکھی۔ اُس کے پاس آئیں۔

''اٹھو میری بچی''۔ انہوں نے اس کا سر سینے سے لگا لیا۔ ''سوچ بھی نہیں آئندہ اس موضوع پر''۔ انہوں نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

اور ـــــ ڈھیر سارے آنسو آنکھوں میں لئے وہ چپ چاپ اُن کے ساتھ چل دی۔

شام کو پھپھو اُسے پڑوس والوں کے یہاں لے گئیں۔ اُن کے یہاں لڑکا ہوا تھا۔ مبارکباد بھی دینی تھی اور مشعل کا دھیان بٹانے کا بھی خیال تھا۔ وہ ننھے سے بچے کو دیکھ کر واقعی بہل گئی۔

مگر ـــــ رات کھانے پر پھپھو نے دیکھا وہ خلافِ معمول پھر چپ چپ تھی۔

پھپھو نے بات چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ سوچا وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی بات مدھم پڑ جائے گی۔

رحمت بابا کے خط کے الفاظ میں ہی کھوئی کھوئی اُس نے پھپھو کو ''شب بخیر'' کہا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔

کس طرح وہ اپنی کوٹھی چھڑوا سکتی تھی اس مکار انسان سے؟ کوئی راستہ؟ کوئی طریقہ؟

پہروں اس کا معصوم ذہن بے بسی سے اِس ادھیڑ بُن میں مصروف رہا۔

''کہتے تھے یہ کوٹھی اور یہاں کی ہر چیز مشعل بی بی کی ہے۔ میں تو صرف رکھوالی کرنا چاہتا ہوں اُن کی بھی اور کوٹھی کی بھی...''۔

الفاظ ہتھوڑے بن کر اس کے ذہن پر برس رہے تھے۔ کروٹیں بدل بدل کر وہ نڈھال ہو رہی تھی۔

'ٹن، ٹن، ٹن، ٹن، ٹن'۔ لاؤنج میں لگے کلاک نے پانچ بجائے۔

وہ چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ پوری رات وہ کہیں سوئی بھی تھی؟ اُس نے نڈھال ذہن سے سوچا۔

بستر چھوڑ کر وہ کھلی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

رات کے اندھیرے چھٹ رہے تھے۔ درختوں میں بسی تاریکیاں منور ہو رہی تھیں اور ـــــ سمندر کے پانی کی سیاہیاں اُجالوں سے ہمکنار ہو رہی تھیں۔

'پھُر' سے اڑتا ننھا سا ایک سرخی مائل نسواری پرندہ اس کی کھڑکی کے پاس والے درخت کی ٹہنی پر آ کر بیٹھتے ہوئے چہکنے لگا۔

''میری آنکھیں زیادہ ڈراؤنی تو نہیں؟'' گلابی، سرخ، نسواری ـــــ شوخ چمکیلے روشن رنگوں نے مل کر جیسے سرگوشی کی۔

اور ـــــ صدیوں کی طرح لمبے کئی اذیت ناک گھنٹوں کے بعد اُس کے نازک لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ اُبھری۔

پھر ـــــ اُسے انوکھی سی خواہش ہوئی۔ اُس نے یہ سب اُسے کیوں نہیں بتایا؟ پل بھر کو اُسے لگا وہ اس کی ساری پریشانی دور کر سکتا تھا، اُس کے ذہن پر کا گراں بار لمحوں میں اٹھا سکتا تھا۔

مگر ـــــ وہ مایوس سی ہوگئی۔ خط کے بعد وہ اُسے ملی ہی کب تھی؟

آج بھی ـــــ وہیں سے آدمی آئے گا پولٹری بانٹنے۔ وہ کیسے اُسے مل سکتی ہے؟

وہ جھنجھلائی سی کھڑکی سے ہٹ آئی۔ باتھ روم گئی۔ اور منہ ہاتھ دھونے لگی۔

ناشتے پر پھپھو نے دیکھا۔ وہ بہت مضمحل لگ رہی تھی۔ یقیناً رات بھر پریشان رہی تھی۔

''بیٹے کیا خیال ہے آج ساتھ والے جزیرے پر چلیں۔ آج کل ٹورسٹ آئے ہیں خوب رونق ہوگی''۔

''ہاں پھپھو چلتے ہیں''۔ وہ اچانک بچوں کی طرح خوش ہوئی۔

اور ـــــ اپنی سکیم کارگر دیکھ کر پھپھو بھی خوش ہوگئیں۔

''اس طرح کرتے ہیں کہ کھانا ساتھ لے لیتے ہیں۔ وہیں سارا دن گزار کر شام کو ہی گھر لوٹیں گے''۔ وہ اُسے زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کی خاطر بولیں۔ ورنہ تو وہ بچاری شاذ ہی اتنی دور جاتی تھیں۔

اور یوں ـــــ وہ دن بھی گزر گیا۔

اگلے دن ـــــ ٹھیک وقت پر مالک کا آدمی آیا اور پولٹری کی وین لے کر چلتا بنا۔

وہ جز بز ہوتی کچن کے دروازے سے دیکھتی رہ گئی۔ شیر شاہ پر اُسے رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔ خواہ مخواہ اُس کا گارڈین بننے کی کوشش کررہا تھا۔ مالک سے کہہ کر ملازم بھجوا کر اُن کی وین چلتی کرکے ـــــ اُسے بے دست و پا کردیا تھا۔

ہونہہ ـــــ بڑبڑاتے ہوئے وہ اندر مڑی۔

''بیگم صاحب''۔ عبداللہ لاؤنج والی طرف سے آکھڑا ہوا۔ ''ہوٹل والوں کے گھر سے بندہ آیا تھا، کہتا تھا اُن کی بہن کی منگنی ہے۔ دس بجے آپ لوگ پہنچ جایئے گا۔ مشعل بی بی کے

لئے خاص تاکید کی ہے''۔

''اچھا ـــــ کہاں منگنی ہورہی ہے کچھ بتایا اس نے؟'' جزیرے پر گنے چنے لوگ تو رہتے تھے، پھپھو کا سب کے یہاں آنا جانا تھا۔

''جی میں نے پوچھا نہیں''۔

''بیوقوف ـــــ پوچھ لیتے پتہ تو چلتا کہاں ہورہی ہے''۔ پھپھو ناشتہ ٹرے میں لگاتے ہوئے بولیں۔

عبداللہ سر کھجاتا ہوا چلا گیا۔

اور مشعل پھپھو کے تجسس پر خوبصورتی سے ہنس دی۔

''پھپھو میں تو ضرور جاؤں گی''۔

''ارے تم ہی جانا ـــــ میری تو کمر کا درد ہی جان نہیں چھوڑتا''۔ انہیں اکثر و بیشتر کمر میں تکلیف رہتی۔ کل سارا دن اگلے جزیرے پر گھومنے پھرنے سے تکلیف اور بھی بڑھ گئی تھی۔

''اوہ ـــــ پھر میں بھی نہیں جاتی''۔ اُن کے درد کا تو اُسے یاد ہی نہیں رہا تھا۔

''نہیں نہیں تم ضرور جانا''۔ ٹرے ہاتھوں میں لئے وہ لاؤنج کی طرف بڑھیں۔ ''ہم میں سے ایک بھی نہیں جائے گا تو وہ لوگ بُرا مان جائیں گے۔ اے بیٹا ہم چند ہی تو لوگ ہیں یہاں۔ ایک دوسرے کا دُکھ سکھ نہیں بانٹیں گے تو اور کون پوچھے گا''۔

اُسے پھپھو کے باہمی میل جول کا جذبہ اچھا لگا۔

''ٹھیک ہے پھپھو''۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

ناشتے پر پھپھو اُسے منگنی سے متعلق یہاں کے دستور و رواج پر دلچسپ باتیں بتاتی رہیں۔

اُس کا اشتیاق اور بھی بڑھ گیا۔

ناشتے سے فارغ ہوکر وہ مختلف کاموں میں پھپھو کا ہاتھ بٹاتی رہی۔

پھر۔۔۔ دس بجنے سے پہلے۔۔۔ جلدی جلدی تیار ہونے لگی۔

کوئی پنک قیمتی ریشم کا سوٹ، ہمرنگ شفون کا دوپٹہ اور میچنگ رنگ کی نازک ڈوری کی سینڈل پہن کر اُس نے آئینے میں اپنے سراپے پر نظر ڈالی۔ تو عجیب سا لگا۔

ریشم کا سوٹ، اونچی ایڑی کی سینڈل۔۔۔ وہ اچھی تو لگ رہی تھی پر نئی نئی، اجنبی اجنبی سی۔ کبھی ریشم پہنا جو نہیں تھا۔۔۔ اکثر بوٹ یا پھر جوگرز جو پہنے رکھتی تھی۔

بالوں میں برش کر کے اُس نے کوئی پنک بڑی بڑی بالیاں اور ان کے ساتھ کی انگوٹھی انگلی میں پہنی۔ کپڑوں پر پرفیوم کا سپرے کیا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

پھپھو نے اُسے دیکھا تو چونک سی اٹھیں۔ عینک اوپر نیچے کرتے ہوئے غور سے دیکھا۔

''اے میں صدقے جاؤں اپنی بچی کے''۔ آگے بڑھ کر انہوں نے اُس کی بلائیں لے ڈالیں۔

''نظر نہ لگ جائے کہیں''۔ اپنی چھوٹی انگلی سے آنکھ کا سُرمہ اتار کر انہوں نے اُس کے گال پر سیاہ دھبہ مزید لگا دیا۔

مشعل کھلکھلا کر ہنس دی۔

''اے میں سچ کہتی ہوں، پاپا کٹن قسم کی عورتوں کے قریب مت بیٹھنا نظر لگا دیں گی ہاں''۔

''اچھا پھپھو''۔ اُسے کہنا ہی پڑا۔

''جاؤ اب''۔ اُسے عبداللہ کے ہمراہ کرتے ہوئے وہ دُور تک اُسے جاتے دیکھتی رہیں۔

انہیں اس کا یوں پیدل جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ گو جگہ زیادہ دور نہ تھی مگر وین ہوتی تو اُسے آرام رہتا۔ اور مشعل۔۔۔

وہ آرام کی کہاں قائل تھی۔ صاف کہہ دیا وین ہوتی بھی تو اتنا سارا راستہ وہ پیدل ہی

جاتی۔

عبداللہ اُسے پہنچا کر واپس چلا آیا۔

ہوٹیل والوں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ لگتا تھا وہ مہمان خصوصی تھی۔ وہ بھی خوب خوب خوش ہوئی۔ سیدھے سادے یہ لوگ اُسے ویسے بھی بہت اچھے لگتے تھے۔ ان کے ہوٹیل پر تو وہ پہلے بھی پولٹری دینے جا چکی تھی۔ یہاں البتہ آج پہلی بار آئی تھی۔ منگنی اور منگنی کی رسمیں دیکھ کر اُسے اور بھی مزا آیا۔

کھانے کے بعد اُس نے اُن لوگوں سے اجازت لی۔ اور۔۔۔ گھر کے لئے چل پڑی۔

عبداللہ کو اُس نے دوبارہ اُسے لینے آنے سے منع کر دیا تھا۔ آسان سا تو راستہ تھا وہ خود بھی جا سکتی تھی۔

تھوڑی دیر قبل کے مدھم ہوا کے جھونکے اب آندھی کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ آن کی آن میں سیاہ گھٹاؤں نے پورے آکاش پر حلہ بول دیا تھا اور۔۔۔ سنسان ماحول کا سناٹا مزید بڑھ گیا تھا۔

کچھ گھبرائی گھبرائی سی۔۔۔ مالک کے باغ کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ باغ کے درختوں پر نظریں جمائے چلی جا رہی تھی۔

دفعتاً اس کی نظر کیلوں کے جھنڈ پر پڑی۔ ادھ پکے کیلوں کے ان گنت گچھے لٹک رہے تھے۔

آندھی، بادل اور ماحول کے سناٹے کا خوف بھول بھال۔۔۔ جانے کیا سوجھی اُسے؟

سینڈل اتار کر اس نے باڑ کے اندر پھینکے اور۔۔۔ ایک ہی جست میں وہ۔۔۔ باغ کے اندر تھی۔

ہاتھ بڑھا کر وہ۔۔۔ گچھا توڑنے لگی۔

''چوری بھی کرتی ہو''۔ کسی نے اس کا آگے بڑھا ہاتھ پکڑا۔

سائیں سائیں کرتا، نیم تاریک پر اسرار ماحول۔ اُس پر لاشعور میں بسا ایک غیر ذمہ دار کام کا خوف۔

اس کا دل زور سے دھڑکا۔ گھبرا کر مڑی۔

شیر شاہ تھا۔ بغور اُسے دیکھ رہا تھا۔ اب بھی اس کا ہاتھ پکڑے تھا۔

"اوہ ــــ آپ ہیں"۔ اُس کی جیسے جان میں جان آ گئی۔ "میں سمجھی..."۔

"مالک آ گیا ہے"۔

"مجھے مالک والک سے ڈر نہیں لگتا"۔ لاپروائی سے کہتے ہوئے اُس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

ایک مبہم سی مسکراہٹ اُس کے لبوں کو چھو گئی۔

"تمہیں معلوم ہے اس باغ میں جزیرے کے مالک کی اجازت کے بغیر کوئی نہیں آ سکتا"۔

"میں تو آ گئی ہوں"۔ اطمینان سے کہتے ہوئے وہ پھر کیلوں کی طرف متوجہ ہوئی۔

مبہم مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"تمہیں اُس سے ڈر نہیں لگتا؟"

"وہ کیا بھوت ہے کہ مجھے اُس سے ڈر لگے"۔ اُس نے گچھا پکڑ کر کھینچا۔

"لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے تو تم چیخنے کو تھیں"۔ قریبی درخت سے ٹیک لگائے، دونوں بازو سینے پر لپیٹے وہ دلچسپی سے اُس سے تکرار کئے جا رہا تھا۔

"وہ تو ــــ دراصل..."۔ وہ ہنوز بھاری سے گچھے سے برسرِ پیکار تھی۔ "بادل آ گئے تھے، اندھیرا ہو گیا تھا، آپ نے ہاتھ پکڑ لیا ــــ تو ــــ مجھے ڈر لگا ــــ کہ پتہ نہیں کیا ہے..."۔ گچھا اس سے کسی طرح توڑا نہ جا رہا تھا۔

"بھوت وغیرہ"۔ وہ اطمینان سے اس کی تگ و دو دیکھ رہا تھا۔

"آپ ــــ آپ ــــ مدد کیوں نہیں کرتے میری"۔ اس کا گہرا اطمینان اور اپنی ناکام جدوجہد دیکھ کر وہ بولے بنا نہ رہ سکی۔

"کیا ضروری ہے کہ تم اِسے توڑو"۔ وہ اب بھی درخت سے ٹیک لگائے بازو سینے پر لپیٹے کھڑا اُسے دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔

"ہاں۔ میں پھپھو کو دکھاؤں گی"۔

تو ــــ اتنی سخت تکلیف ــــ پھپھو کو اپنا کارنامہ دکھانے کے لئے کی جا رہی تھی۔

"انہوں نے بہتیرے دیکھے ہیں یہ گچھے"۔

"اوہ"۔ سب چھوڑ چھاڑ۔ وہ بے حد مایوسی سے بولی۔

"جناب"۔ وہیں کھڑے کھڑے اُس نے دلنشیں آنکھیں اثبات میں بند کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے بائے دا وے ــــ آج ــــ ایسے موسم میں"۔ وہ اوپر، اِردگرد نظریں ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔ "پیدل ــــ اکیلے کیسے آمد ہوئی؟"

"ہوٹیل والوں کے یہاں منگنی پر گئی تھی"۔ وہ کیلوں سے قدرے اس طرف آئی۔

"اے ــــ تم تو لڑکی ہو"۔ اُس نے جیسے پہلی بار غور کیا، ان سنی کرتے ہوئے درخت سے ہٹ آیا، کان میں پہنی اس کی بالی سے کھیلتے کھیلتے وہ اسے سر سے لے کر پاؤں تک گھورنے لگا۔

اس کی آنکھوں میں شوخی کی چمک تھی۔ ہونٹوں پر شریر تبسم۔

اس کے ریشمی رنگین کپڑے، کانوں میں بالیاں، انگلی میں انگوٹھی ــــ یہ سب شیر شاہ کیلئے بھی نئے تھے۔

اور شاید زندگی میں پہلی بار مشعل کو بھی احساس ہوا۔ وہ تو واقعی لڑکی تھی۔

جبھی تو ــــ چہرہ تپ سا اُٹھا تھا اس کی بات پر!۔

دل دھڑک سا اُٹھا تھا۔اُس کے گھورنے کے انداز پر!۔

"وہ ___ وہ منگنی تھی نا..."۔پلکیں جھپکا جھپکا کر وہ جیسے صفائی دینے لگی۔

وہ ہنس دیا۔مدھر،خوبصورت ہنسی۔

"آؤ تمہیں باغ دکھادوں"۔

"میں ___ نہیں چل سکوں گی اس سینڈل میں"۔وہ قریب پڑے سینڈل پہننے لگی۔

اوہ ___ تو محترمہ اونچی ہیل بھی پہن کر آئی تھی۔اس کے گلابی گلابی نازک پاؤں دیکھ کر وہ ___ ایک بار پھر ہنس دیا۔

"اچھا آؤ ___ وہاں بیٹھتے ہیں"۔اُس نے قریب ہی بنے چھپر کی طرف اشارہ کیا۔

"لیکن میں گھر..."۔

"چھوڑو گھر"۔اُسے ہاتھ سے پکڑ کر وہ چلتا بنا۔"اتنے دن بعد تو نظر آئی ہو"۔

"آپ ہی نے تو مالک سے کہا ہے۔روز آدمی بھجوادیتا ہے"۔اس کی آواز میں شکوہ نمایاں تھا۔

وہ زور سے ہنس دیا۔

"میں تو بات کر کے پچھتایا،کیا پتہ تھا تم نظر ہی نہیں آؤ گی پھر"۔

مُڑ کر اُس نے مشعل کی آنکھوں میں دیکھا۔

کچھ بات ضرور تھی اس کی نظروں میں۔وہ ڈول سی گئی۔

"کہہ دیں مالک سے کل سے آدمی مت بھیجے۔میں خود بھی بور ہوتی رہتی ہوں گھر میں"۔

موقعہ غنیمت جان کر اس نے سنبھلتے ہوئے جلدی سے کہا۔

"بس بور ہوتی رہتی ہو"۔اُسے اپنے مقابل کی کین کی کرسی پر بٹھاتے ہوئے وہ خود بھی بیٹھ گیا۔

"ہاں"۔

"کبھی ___ اُس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکادیا،سامنے دیکھنے لگا۔"اور بھی خیال آیا؟"

"کیا مطلب؟"وہ سادگی سے پوچھنے لگی۔

"کچھ نہیں"۔خوبصورتی سے کندھے اُچکاتے ہوئے وہ سیدھا ہو بیٹھا۔"اچھا اور سناؤ کیا گپ شپ ہے؟"

اور ___ مشعل کو رحمت بابا کا خط یاد آ گیا۔اداس سی لگنے لگی۔

"میرے گھر سے خط آیا تھا"۔

شیر شاہ چونک سا گیا۔

"ہمارے پرانے ملازم رحمت بابا کا۔ایک اور بھی خط آیا تھا میرے پاپا کے بہت پُرانے قریبی دوست بیرسٹر عرفان احمد کا"۔

وہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔"رحمت بابا کا خط پڑھ کر مجھے اپنا گھر یاد آیا۔بہت ساری چیزیں ،بہت ساری باتیں ___ پھر کچھ ایسی بھی باتیں لکھی تھیں۔جن کی وجہ سے میں پریشان رہی۔ساری رات سو نہ سکی"۔

شیر شاہ ___ پریشان سا،اُداس سا،فکرمند سا ___ اُسے دیکھ رہا تھا۔

"صبح صبح اُٹھی ___ کھڑکی میں سے دیکھا،ایک ننھا سا پرندہ قریب کے درخت پر آ کر بیٹھا۔اس کے ریڈش براؤن چمکیلے رنگ دیکھ کر مجھے"___ وہ ہولے سے ہنس دی۔"آپ کی آنکھیں یاد آ گئیں..."۔

کتنی معصوم تھی وہ ___ کسی بھی داؤ پیچ سے ناآشنا۔کسی بھی جذبے کی نوعیت سے بے خبر۔

وہ دھیرے سے مسکرادیا۔گو اب بھی پریشان تھا،اُداس تھا۔اور ___ بہت فکرمند۔

"پھر؟"

"مجھے خیال آیا خط کی ہر بات میں نے آپ کو کیوں نہیں بتادی..."۔

"اوہ۔۔۔" کیا وہ اتنا ہی اہم تھا۔ وہ اپنائیت سے اُسے دیکھنے لگا۔

"مگر پھر مجھے خیال آیا خط کے بعد میں آپ سے ملی ہی کب تھی۔۔۔"۔ وہ اچانک ٹپ ٹپ گرتی موٹی موٹی بوندوں کو دیکھنے لگی۔ "اس بارش میں میں گھر کیسے جاؤں گی؟" وہ یکدم ہی پریشان سی بولی۔

"ہاں۔۔۔ اب گھر کیسے جاؤ گی"۔ وہ سنجیدہ تھا پھر بھی اُسے تنگ کر رہا تھا۔ "آؤ سامنے کے جھنڈ میں بیٹھتے ہیں وہاں پانی نہیں آتا"۔ بارش کی اچانک بوچھاڑ سے بچنے کے لئے وہ کرسی سے اٹھا اور۔۔۔

اُسے تیزی سے قریبی درختوں کے جھنڈ میں لے گیا۔ درخت کے موٹے سے تنے سے ٹیک لگا کر وہ بیٹھ گیا۔ اپنے قریب ہی اُسے بھی بٹھا لیا۔

"رحمت بابا نے کیا لکھا تھا خط میں؟" وہ اس کے چہرے سے بھیگے بالوں کی لٹ ہٹاتے ہوئے اپنائیت سے پوچھنے لگا۔

"اوہ"۔ مشعل کے چہرے پر اچانک نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔

نیلگوں آنکھوں میں حقارت ابھر آئی۔ "یہی کہ۔۔۔ جس آدمی کے پاس پاپا نے ہماری کوٹھی گروی رکھوائی ہے"۔ اُسے یقین تھا پھپھو شیر شاہ کو سب بتا چکی تھیں۔ "وہ اُن لوگوں پر بہت مہربان ہے اور۔۔۔ اور"۔۔۔ اُس کے لہجے میں نفرت انتہا پر تھی۔ "وہ کہتا ہے۔۔۔ کہ یہ کوٹھی اب بھی میری ہے۔ وہ تو۔۔۔ صرف رکھوالی کرنا چاہتا ہے۔ میری بھی اور کوٹھی کی بھی۔۔۔ اور I hate him . . . I hate him ..."۔ ہذیانی انداز میں کہتے کہتے بازو میں منہ چھپا کر وہ بے اختیار رو دی۔

شیر شاہ ساکت سا اُسے دیکھتا رہا۔

کچھ بن ہی نہ پڑ رہا تھا اُس سے۔۔۔ بول ہی نہ پڑ رہا تھا اُس سے۔ کچھ بول ہی نہ

سکتا تھا جیسے۔

وہ روتی رہی، پھوٹ پھوٹ کر۔

اور۔۔۔ شیر شاہ اُسے دیکھتا رہا۔۔۔ Shocked سا۔ اور۔۔۔ بے بس سا۔

کئی لمحے بیت گئے۔

رو دھو کر وہ دل کا بھڑاس نکال چکی تھی۔ انگلیوں کی پوروں سے آنسو صاف کرتے ہوئے اُس نے سر اوپر اٹھایا۔

وہ اب بھی اُسے دیکھ رہا تھا۔

بھیگی متورم آنکھیں لئے، وقفے وقفے سے ہچکیاں لیتی وہ بہت معصوم لگ رہی تھی۔

وہ۔۔۔ بے بس سا مسکرا دیا۔

"اگر۔۔۔ وہ آدمی"۔ اس نے نرم لہجے میں ابتداء کی۔ "تمہارے ملازموں پر۔۔۔"۔

"وہ اب میرے ملازم نہیں ہیں"۔ اُس نے تیزی سے اُس کی بات کاٹ دی۔

"اوہ"۔ چند ثانیے وہ متعجب سا اُس کے ردعمل کو دیکھتا رہا۔ پھر۔۔۔ ایک گہری سانس لی۔

اچھا تمہارے نہیں ہیں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر وہ آدمی ان ملازموں پر مہربان ہے۔ یا وہ کہتا ہے کہ وہ کوٹھی اب بھی تمہاری ہے اور وہ تمہاری اور تمہاری کوٹھی کی رکھوالی کرنا چاہتا ہے تو اس میں کیا برائی۔۔۔

"Stop it , Stop it"۔ وہ آپے سے باہر ہو کر چلائی۔ "وہ بہت عیار ہے، وہ بہت مکار ہے۔۔۔"۔

شیر شاہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"اچھا اچھا۔۔۔ پلیز۔۔۔ Relax"۔ وہ پریشان سا بولا۔

اور۔۔۔ مشعل نے سر گھٹنوں پر رکھ دیا۔

"میں چند دنوں تک جا رہا ہوں وطن ___ تم کہو تو ___ میں اس آدمی سے مل لونگا۔ اُسے سمجھانے کی کوشش کرونگا..."۔

"کیا؟" وہ سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"ہاں ___ کوشش کر دیکھنے میں کیا حرج ہے؟"

"کیا کوشش کریں گے آپ؟" وہ اُسی تعجب اور تیزی سے پوچھنے لگی۔

"کہ" ___ اُس سے بات ہی نہ بن پڑ رہی تھی۔ "کہ کیوں تمہاری املاک پر قبضہ جمائے بیٹھا ہے"۔

"آپ ___ بھکاری سمجھتے ہیں مجھے؟ میں بھیک مانگوں گی اُس سے ___ اُس..."۔ اُسی کی وجہ سے تو اُس کے پاپا کو دل کا دورہ پڑا تھا، زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ وہ پاگل سی ہونے لگی۔ "اُس نیچ انسان سے..."۔

اور ___ شیر شاہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آؤ تمہیں گھر چھوڑ آؤں"۔ اُس نے اُسے ہاتھ سے تھاما۔

"نہیں جاؤں گی گھر"۔ اُس نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑوا لیا، پھر سر گھٹنوں پر رکھ لیا، ایک بار پھر رو دی۔ اُسے ___ دوبارہ بیٹھنا پڑا۔

اُس وقت واقعی وہ نارمل نہیں تھی۔ وہ پریشان سا اُسے دیکھتا رہا۔

کافی دیر رو لینے کے بعد ___ اُس نے سر اُٹھایا ___ آنسو پونچھے۔

"میں گھر جاؤں گی"۔ وہ آہستہ سے بولی۔

کندھے اُچکاتے ہوئے وہ دھیرے سے مُسکرا دیا۔ مضمحل سی، نڈھال سی مسکراہٹ۔

"کبھی گھر نہیں جاتی ہو، کبھی گھر جاتی ہو"۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

وہ بھی اُٹھی۔

بارش اب تھم چکی تھی ___ مگر ___ اُس نے مشعل پر نظر ڈالی۔ اُس کے اندر کا لاوا جیسے پکتا ہی جا رہا تھا۔ اور زیادہ، اور تیزی سے۔

وہ خاموشی سے اُس کے ساتھ چلنے لگا۔ کبھی سرسبز جھاڑیوں کے بیچ سے اور کبھی اونچے اونچے پام کے درختوں کے درمیان سے۔

اُسے گھر تک پہنچا کر وہ واپس پلٹا۔ اُس کے پُرکشش نقوش سوچوں میں ڈوبے تھے۔ دلنشیں آنکھیں متفکر تھیں۔

اُس دن کے بعد سے مالک کے آدمی نے آنا بند کر دیا۔ مشعل بہت خوش تھی کبھی کبھار عبداللہ ورنہ وہ ہی پولٹری دینے جانے لگی تھی۔ اسی بہانے وہ پُورا علاقہ گھوم آتی تھی۔

آج عبداللہ جانے لگا تھا جزیرے پر۔

پھپھو صبح ہی صبح ناشتے کی تیاری میں مصروف تھیں۔ مشعل کو بھی جگا لیا تھا۔ دراصل آج درزن کے بہو کے یہاں بچے کی پیدائش متوقع تھی۔ پھپھو خود اگرچہ لاولد تھیں مگر انسانی ہمدردی کے ناطے کئی سال سے اسی جزیرے پر حتی الوسع بیماروں کی تیمارداری کرنا ___ زچہ و بچہ کی خبر گیری کرنا اپنا وطیرہ بنا رکھا تھا، اور کرتے کراتے اس قدر ماہر ہو گئی تھیں کہ جزیرے کے لوگ انہیں ایسے موقعوں پر ایک نرس کی حیثیت دینے لگے تھے۔

اس وقت بھی وہ جلدی جلدی کام سے نمٹ رہی تھیں۔

''اے مشعل بیٹا آج عبداللہ چلا جائے گا کام پر۔ تم ذرا میرا ایک کام کر دینا''۔

''کیا پھپھو؟''

''میرا بچہ کشتی پر جا کے ذرا کچھ چیزیں لے آنا بڑے جزیرے سے ضروری چاہئیے ہوں گی''۔ بڑے جزیرے سے مشعل واقف تھی، پہلے بھی ان کے ساتھ وہ ایک بار جا چکی تھی۔ ''ضرورت تو شام کو پڑے گی ان چیزوں کی مگر تم ابھی چلی جانا۔ عبداللہ سے نہیں منگوا سکتی''۔ ان کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا۔ کام دراصل عورتوں والا ہے...''۔

اور ___ وہ گھبرا گئی ___ ایسے کام اس کے بھی تو بس کے نہیں تھے۔

''پھپھو میں کیا سمجھوں گی''۔ وہ جلدی سے بول پڑی۔

''ارے اُس میں سمجھنے کی بات نہیں ہے''۔ پھپھو بے اختیار ہنس دیں۔ ''میں تمہیں لسٹ دے دوں گی۔ دُکان کا نام بھی لکھ دیتی ہوں۔ لسٹ دکھا دینا وہ خود ہی ہر چیز دے دیں گے''۔

''اوہ ___ اچھا''۔ اُس نے نجات کی سانس لی۔

اور اب ___ وہ بہت خوش تھی۔ کشتی پر وہ ابھی پچھلے دنوں بھی بڑے جزیرے پر بینک سے چیک کیش کرانے کے سلسلے میں جا چکی تھی۔ مگر تب پھپھو بھی ساتھ تھیں۔ اس بار وہ اکیلی جا رہی تھی۔ تو کیا ہوا۔ اتنے سارے لوگ تو ہوتے ہیں کشتی پر ___ اور پھر مزا کتنا آتا ہے!

ناشتہ سے فارغ ہو کر اُس نے کالر اور ہاف سلیوز کی گلابی چیک کی قمیص شلوار پہنی، گلابی دوپٹہ لیا۔ گھنے بالوں میں سُرخ چوڑے ربن کی بڑی سی بو لگائی، سُرخ ہی لیدر کے شوز پہنے اور شوپنگ کی ٹوکری اور لسٹ لیے۔ چلتی بنی۔

درختوں اور جھاڑیوں کے بیچوں بیچ آگے بڑھتی ___ وہ ساحل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

نیلگوں آکاش شفاف تھا۔ ہوا تھی رُکی رُکی سی اور ___ درخت ہی درخت جس کو جنم دے رہے تھے۔

تیز تیز چلتی ___ وہ ساحل پر پہنچ گئی۔ دیکھا۔ دُور ___ کنارے پر کھڑے ___ اور بھی لوگ کشتی کے منتظر تھے۔

وہ انہی کی طرف بڑھنے لگی۔ پانی کے کنارے کنارے وہ بھیگی چمکیلی ریت پر چلی جا رہی تھی۔

معاً ___ انجن کے شور پر وہ چونکی۔ قریب ہی ایک بوٹ آ کر رُکی۔

اور ___ اُس سے باہر نکلتا ___ شیر شاہ تھا۔

سفید قیمتی سوٹ میں ملبوس سفید ہی لیدر کے شوز پہنے، نپے تلے قدم اُٹھاتا جیسے کوئی گریک گوڈ چلا آ رہا تھا۔

مشعل کی خوبصورت سی آنکھوں میں قندیلیں سی جل اُٹھیں۔ یاقوتی لب خود بخود مسکرا دیئے۔

''کہاں جارہی ہو؟'' وہ پاس چلا آیا۔

''شوپنگ کیلئے، بڑے جزیرے پر''۔

''چلو پھر''۔ اُس نے بوٹ کی طرف اشارہ کیا۔

''واپس کب لوٹیں گے؟'' پھپھو نے جو کہا تھا چیزیں ضروری چاہئے تھیں۔

''کیوں؟''

''مجھے جلدی واپس آنا ہے''۔

''شام تک آجائیں گے''۔

''نہیں نہیں۔ یہ چیزیں ضروری چاہئیں''۔ وہ جلدی سے بولی۔

اور ـــ گلابی چیک ڈریس، سُرخ بو اور سُرخ شوز میں ٹوکری ہاتھ میں جھلاتی وہ اُسے ریڈ رائیڈنگ ہڈ لگی۔

وہ مسکرادیا۔ دھیرے سے۔

''اچھا۔ بندوبست کر دوں گا۔ آؤ''۔

کتنا فراخدل تھا، مصالحت آمیز ـــ بھولی سی مشعل متاثر نظر آنے لگی۔

یہ وہی شام والی بوٹ تھی۔ یقیناً مالک کی ذاتی تھی۔

وہ اسے سیدھا کیفے میں لے گیا۔

''آج تم خود لو جو چیز تمہیں اچھی لگے''۔ وہ کاؤنٹر کی طرف بڑھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں

اپنے لیے کوفی بنانے لگا ہوں''۔

وہ واقعی اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ آخر تو وہ اتنے دنوں سے اُسے مل رہی تھی۔ اب وہ اجنبی تھوڑی رہا تھا ـــ بلکہ ـــ وہ تو اُسے جیسے مدتوں سے جانتی تھی، زمانوں سے پہچانتی تھی۔

کھولتی ہوئی بلیک کوفی کا مگ لیے وہ میز پر آ گیا۔ مگ رکھا ـــ اور تھکا تھکا سا کرسی کی پُشت پر سر ٹکاتے ہوئے ڈھیر ہو گیا۔

پھر ـــ جیسے چونکتے ہوئے اُس نے میز پر ایک طرف رکھی ٹوکری میں رکھا مشعل کا شاپنگ لسٹ اُٹھا لیا۔

''فیڈر ایک عدد، نیپل فالتو ایک عدد، دودھ کا ڈبہ ایک عدد...'' وہ اونچی آواز میں پڑھنے لگا۔

''درزن کے بیٹے کے گھر میں بے بی آنے والا ہے نا یہ اُس کی شوپنگ ہے''۔ وہ مڑے بغیر، ہنٹر بیف اور ٹماٹروں کا سینڈوچ بناتے ہوئے سادگی سے بولی۔

وہ ـــ ہولے سے مسکرادیا۔

کتنی بھولی سی تھی۔ کچھ بھی ڈھکنا چھپانا نہ جانتی تھی۔

اُس نے پھر سے نظریں لسٹ پر جمادیں۔

''زیتون کا تیل، پینٹی اور...''۔ مسکراتے ہوئے اُس نے لسٹ واپس رکھ دی۔

یقیناً مشعل نے یہ لسٹ خود نہیں پڑھی تھی۔ ورنہ اُسے پڑھتا دیکھ کر وہ یوں اطمینان سے سینڈوچ بنانے میں مصروف نہ رہتی۔

کئی چیزیں لسٹ میں ایسی تھیں جنہیں آج مشعل بھی پڑھ کر سٹپٹائے بنا نہ رہتی۔

گھونٹ گھونٹ کر کے وہ حلق [illegible] اُتارنے لگا۔

''اور کیا لکھا ہے لسٹ میں؟'' دانتوں سے سینڈوچ کاٹتے ہوئے وہ پاس آ کر اُس کے

مقابل والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''خود پڑھ لو''۔ وہ کوفی سے اٹھتی بھاپ پر نظریں جمائے ہوئے دھیرے سے بولا۔

اور ـــ اُس نے لسٹ اٹھا کر اپنے آگے رکھ لی۔

''فیڈر، نپل، دودھ، تیل، پینٹی...''۔ کہتے ہوئے اُس نے لسٹ آہستہ سے تہہ کر لی۔

شیر شاہ کی نظریں اب بھی کوفی پر تھیں۔ پرکشش ہونٹ ہنسی کا بار اٹھانے سے قاصر لگ رہے تھے۔

ایک چوری نظر شیر شاہ پر ڈالتے ہوئے وہ سینڈوچ کھانے لگی۔

شیر شاہ نے نظر اٹھا کر اُسے دیکھا۔

اُس کے چہرے پر حیا کی لالی تھی، ہونٹوں پر کپکپی، اور ـــ گھنی خمیدہ پلکیں آنکھوں پہ چلمن کئے تھیں۔

اس کا یہ روپ اُس نے پہلی بار دیکھا تھا۔

اچانک وہ موازنہ کرنے لگا۔

اسی بوٹ میں پہلے دن جب وہ اس سے ملا تھا۔

وہ بالکل لڑکوں کی طرح تھی۔ لاپرواہ سی، لا اُبالی سی، گردوپیش سے بے خبر ـــ اُس کے سامنے بیٹھا جوان مرد ـــ جیسے کوئی خاص بات ہی نہ تھی۔

آج ـــ وہ بالکل لڑکیوں کی طرح تھی۔ لاپروائی کچھ کم تھی، لا اُبالی پن مدھم، گردوپیش کی جیسے سمجھ آنے لگی تھی۔ اور ـــ اُس کے سامنے بیٹھا جوان مرد ـــ جیسے اہمیت پانے لگا تھا۔

اس میں یہ نمایاں فرق ـــ ایک دن میں نہیں آیا۔

دھیرے دھیرے، بتدریج آیا تھا۔ اُس کے [illegible] کے مشاہدے میں آیا تھا۔

یہی نمایاں فرق اس کی نوٹس میں تھا اسی لئے تو یقین تھا وہ سٹ پٹا جائے گی۔

ورنہ تو ـــ یہی لسٹ اگر وہ پہلے دن اُس کے سامنے پڑھتی ـــ

تو اوّل تو سمجھ نہ پاتی کہ یہ آئیٹم تھے کیا چیز؟ اور پھر سمجھ بھی لیتی تو یہ جان نہ پاتی کہ اس میں کسی جوان آدمی کے سامنے دھرانے پر سٹپٹانے کی کیا بات تھی؟

''اتنے دن ـــ کیا عبداللہ وین لے کر نکلتا تھا؟'' خالی مگ میز پر رکھتے ہوئے اس نے کچھ سوچتے سوچتے موضوع بدل دیا۔

''نہیں تو''۔ وہ بھی سنبھل گئی۔

''کیا مطلب؟''

''میں بھی لے کر جاتی ہوں''۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تو مجھے کیوں نظر نہیں آئیں''۔

اس کے لب و لہجے پر وہ ـــ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''اب اس میں میرا کیا قصور ہے''۔

وہ تو انکساری بھی سیکھ گئی تھی۔ تحمل بھی۔

وہ بھی ہنس دیا۔ پھر سنجیدہ ہو گیا۔ کچھ سوچنے لگا۔

''میں تمہیں نظر نہ آؤں تو ـــ تمہیں خیال نہیں آتا؟''

''کہ میں تمہیں کیوں نظر نہیں آیا؟''

''آں... نہیں''۔

''اوہ'' ـــ وہ چپ سا ہو گیا ـــ ''اچھا''۔ وہ پھر سوچ سوچ کر کہنے لگا۔

''آج میں تمہیں ساحل پر ملا تو تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟''

''ہوئی''۔

''کیسی خوشی؟'' جانے کیا جاننا چاہتا تھا وہ؟

"بس خوشی ہوئی"۔ آخری نوالہ لے کر نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے لاپرواہی سے بولی

شیر شاہ نے ایک گہری سانس لی۔ میز کو پاؤں سے قدرے کھسکا کر دونوں ٹانگیں اُس پہ سیدھی پھیلاتے ہوئے تھکی تھکی سی آنکھیں موند لیں۔

"آپ میز میرے اوپر گرا رہے ہیں"۔ اس نے احتجاج کیا۔

"کرسی پیچھے کھسکا لو"۔ وہ آنکھیں کھولے بغیر بولا۔

"نہیں۔ آپ پاؤں اٹھالیں میز سے"۔ وہ بھی ضد کی کم نہ تھی۔

"میں تھکا ہوا ہوں"۔ اُس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔

اور ___ مشعل نے اٹھتے ہوئے اُس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر ___ گھما کر ___ میز کے نیچے رکھ دیں۔

اور ___ مسکراتے ہوئے اُس نے دوبارہ پاؤں اوپر میز پر پھیلا دیئے۔

پہلوؤں پر ہاتھ دھرتے ہوئے وہ جھنجلا کر وہاں سے چلتی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

"مجھے یاد کیا تھا اتنے دن؟" وہ بالکل پاس سے بولا۔ قریب چلا آیا تھا وہ۔

وہ سادگی سے ہنس دی۔ کیا رٹ لگائے تھا۔

وہ اُسے کیوں نظر نہیں آیا ___ یہ خیال کبھی اُسے آیا تھا؟ ___ شاید ___ پتہ نہیں یہاں وہ واضح نہ تھی۔

آج وہ اُسے ساحل پر ملا تھا تو ___ اُسے خوشی ہوئی تھی؟ ___ ہاں ___ یہ اسے ضرور محسوس ہوا تھا۔

اس کو اتنے دن یاد کیا تھا؟ یہاں بھی وہ کلیئر نہ تھی۔

ہاں۔ گھر پر ___ کبھی کبھی ___ اس کا خیال [illegible] ضرور آتا تھا۔

بلکہ پچھلے دنوں رحمت بابا کا خط آیا تھا تو بے اختیار اس نے چاہا تھا وہ اپنا دکھ اُسے بتاتی۔

"سوچو نہیں"۔ وہ مسکرایا، جیسے اُس کی اُدھیڑ بُن سمجھ گیا تھا۔

واپس پلٹا۔

"آؤ اوپر چل کر بیٹھتے ہیں"۔ وہ آگے بڑھا۔

کاؤنٹر کے پاس سے گزرتے ہوئے جانے کیسے؟ پھل کاٹنے کی تیز چھری اُس کی ہتھیلی میں لگی اور ___ آن کی آن میں اس کا ہاتھ خون میں نہا گیا۔

مشعل کی نظر پڑی ___ تو چیخ سی نکل گئی۔ دوڑ کر پاس آ گئی۔

"کیا ہوا؟" اُس نے بے اختیار اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

زخم کافی گہرا تھا۔ خون اُبل اُبل کر باہر آ رہا تھا۔

"چھری لگی ہے"۔ اُس کی آنکھوں میں تکلیف تھی، لبوں پر دھیمی مسکراہٹ۔

مشعل نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کچھ بن نہ پڑا ___ تو جلدی سے اپنا دوپٹہ پھاڑ لیا۔ تیزی سے اُس کے ہاتھ پر باندھنے لگی۔

وہ مسکراتا ہوا اطمینان سے کھڑا ___ اپنے آپ کو اس کے حوالے کئے تھا۔

جبکہ ___ بوٹ میں فرسٹ ایڈ کا پورا سامان موجود تھا۔

زخم باندھ کر وہ سیدھی ہو کر کھڑی ہوئی۔

"بہت تکلیف ہو رہی ہے؟" وہ پریشان تھی۔

"ہاں"۔ اچانک اس کی آنکھوں میں کرب سمٹ آیا۔ لہجہ میں درد ابھر آیا۔

مشعل کی آنکھوں میں بھی دکھ اُترنے لگا۔ بدلیاں سی منڈلانے لگیں۔

"اف"۔ وہ تکلیف سے کراہا۔

اور ___ بے اختیار ___ وہ اس کے ہاتھ پر جھک گئی۔

بے ساختہ ___ اُس کے ہونٹ زخم پر ٹک گئے۔

"ٹھیک ہو جائے گا"۔ اس نے جھکا سر اٹھایا۔

اس کی آنکھوں میں اب بھی دکھ تھا، بدلیاں اب بھی منڈلا رہی تھیں۔

مگر ___ وہ چونکی ___ شیر شاہ کے دلنشیں آنکھوں میں شوخی تھی، پرکشش ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ تھی۔

اور ___ جیسے وہ سمجھ گئی ___ یہ سب اس نے جان بوجھ کر کیا تھا۔

تکلیف اُسے ضرور تھی۔ مگر ___ واویلا اُس نے جان بوجھ کر مچایا تھا۔

پتہ نہیں کیوں؟ وہ خجل سی نظر آنے لگی۔

"آؤ اوپر چلیں"۔ وہ دھیرے سے بولا۔

"نہیں"۔ وہ آہستہ قدم چل کر میز کے پاس اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

وہ مسکرا دیا۔ دو قدم چل کر ___ وہ بھی اس کے مقابل اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"چپ چپ کیوں ہو؟" اُس کے جھکے سر کو تکتے ہوئے وہ ہولے سے بولا۔

منہ پھولا پھولا سا تھا، اپنے آپ سے الجھی الجھی سی تھی۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

سر کرسی کی پشت سے ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔

رات دیر تک آفس میں کام کرتا رہا تھا۔ قانون کی موٹی موٹی کتابیں کئی بار الٹ پلٹ کی تھیں، ایک بہت اہم کیس کے سلسلے میں۔ کہ وہ ایک وکیل بھی تھا۔

صبح بھی بہت سویرے جاگا تھا۔ تھکا ہوا تھا ہی، اوپر سے زخم۔ خون اب بھی نکل رہا تھا۔

مشعل نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر نقاہت طاری ہو رہی تھی۔ تھکی تھکی بند آنکھیں مضمحل لگ رہی تھیں۔

اور ___ مشعل کو پہلی بار احساس ہوا۔

اُس نے ___ اُس کے لئے تڑپ سی محسوس کی تھی، عجیب سی، انوکھی سی۔

وہ ہر الجھن بھول بھال گئی۔

"آپ ___ وہاں پہنچ کر پہلے ڈاکٹر کو دکھا دیں"۔

اُس نے بھاری پپوٹے وا کر دیئے۔ بڑی بڑی ریڈش براؤن آنکھیں اس پر جما دیں۔

"وہاں کئی ضروری کام ہیں مجھے ___ اور پھر یہ کوئی خاص بڑا زخم بھی نہیں"۔ اُس نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ پٹی خون سے تر ہو رہی تھی، انگلیاں خون میں بھیگ رہی تھیں۔

اٹھ کر مشعل پیپر نیپکن اٹھا لائی۔

"آپ کیسے کہتے ہیں بڑا زخم نہیں ___ خون اتنا نکل رہا ہے اور..." اس کی کرسی کے پاس کھڑی ہو کر وہ نیپکن سے اس کے زخم کے ارد گرد کی جگہ صاف کرنے لگی۔ "پہلے ڈاکٹر کو دکھائیں پھر ضروری کام کریں"۔

وہ مسکرا دیا ___ دھیرے سے۔

"نہیں دکھاؤں گا تو کیا فرق پڑے گا"۔

"پڑے گا"۔ اس کا ہاتھ ہاتھ میں لئے وہ دھیرے دھیرے خون صاف کر رہی تھی۔

"پھپھو کو ___ دکھ ہو گا۔

اور ___ شیر شاہ کا زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

جانے کیوں؟ اُس نے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا ___ اپنے دل کا چور جاننے لگی تھی شاید۔

"بس ___ پھپھو کو دکھ ہو گا"۔ رُخ اٹھا کر وہ اُسے دیکھنے لگا۔

وہ سُرخ ہو گئی۔ اب تو اُس کی باتوں کی ہیر پھیر صاف سمجھنے لگی تھی۔

"ہوں ___ بتاؤ نا"۔

وہ اب بھی چپ رہی۔ کہتی بھی کیا۔

"بولو نا"۔

مشعل کی نظریں اٹھیں۔

نقاہت کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں اور بھی بہت کچھ تھا۔

کئی سوال، کئی پہیلیاں تھیں۔ کئی کہانیاں، کئی داستان تھے۔

اس کی پلکیں گرنے اٹھنے لگیں۔

محظوظ ہوتا وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

"اسے۔۔۔ وہ دراز کھولو"۔ اُس نے سامنے کاؤنٹر کی طرف اشارہ کیا۔ "نیپکن ہوگا لاکر باندھ دو"۔

پتہ نہیں کیوں اُسے مشعل سے تیمارداری اچھی لگ رہی تھی۔ ورنہ تو بوٹ میں فرسٹ ایڈ بکس میں تمام سامان موجود تھا اور کیپٹن ڈریسنگ کرنا اچھی طرح جانتا تھا۔

وہ جا کر دراز سے ڈنر نیپکن اٹھا لائی۔

"کس کر باندھنا"۔

اور مشعل نے زخم اچھی طرح باندھ دیا۔

"ڈاکٹر کو دکھائیں گے نا"۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے آرام سے بولی۔

"ضرور دکھاؤں گا"۔

"وہاں ضروری کام کونسے ہیں؟"

"ہاں۔ کئی کام ہیں۔۔۔ بینک جانا ہے، جہاز کی سیٹ CONFIRM کرانا ہے، ایئر پورٹ پر بھی کام ہے کچھ، اور۔۔۔ شام کو۔۔۔ ایک فرینڈ پہنچ رہی ہے اس کو ایئر پورٹ سے گھر لانا ہے۔۔۔"۔ اس کی طرف دیکھتے دیکھتے وہ کہتا گیا۔

اور۔۔۔ اُس نے محسوس کیا۔ مشعل کا رنگ واضح طور پر بدل گیا تھا۔

ایک مبہم سی مسکراہٹ شیر شاہ کے پر کشش ہونٹوں کو چھو گئی۔

"میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلو گی نا؟" اُس کی کُرسی کی پشت تھامے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"نہیں"۔ اُس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

وہاں سے چل کر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

وہ تو۔۔۔ اچانک بدل گئی تھی۔ تلخ اور کرخت ہو گئی تھی۔

اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

وہ بالکل بچی تھی۔ کوئی بھی جذبہ چھپا نہیں سکتی تھی۔ ہر کام براہ راست کرتی تھی۔

"دیکھو۔۔۔ میرے زخم سے پھر خون آنے لگا ہے"۔ وہ سفید نیپکن پر اُبھرتے سُرخ سُرخ خون کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تو میں کیا کروں؟"

اور۔۔۔ وہ تو جیسے کاٹ کھانے کو تھی۔

وہ ہنس دیا۔ مدھر، دلآویز ہنسی۔

"اگر مجھ کو کچھ ہو گیا تو؟"

"آپ۔۔۔ مرجائیں میری طرف سے"۔ رُخ باہر کی طرف کرتے ہوئے وہ چلائی۔

اور۔۔۔ شیر شاہ نے محسوس کیا۔ اُس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

وہ حیرت سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔۔۔ وہ اس شدت سے اُسے چاہنے لگی تھی۔

اپنی بیقراری، اپنی بے تابیوں کا خیال آتا تھا تو ہنسی آجاتی تھی اُسے۔ اُس نے تو ایسی بچی سی، پاگل سی لڑکی کو پیار کیا تھا۔۔۔ جو شاید اُس کے جذبات سمجھ ہی نہ پاتی۔ اگر کبھی وہ سمجھانے

میں کامیاب بھی ہو جاتا۔ تو شاید ہنسی میں اڑا کر اس کا مذاق اڑاتی ۔۔۔ یا ۔۔۔ غنڈہ بدمعاش سمجھ کر پولیس میں رپورٹ درج کرانے دوڑتی۔

تصور ہی تصور میں اُس نے اُسے پیار کے اظہار پر بچوں کی طرح تالیاں پیٹتے دیکھا تھا۔ کئی بار پولیس سٹیشن فون کرنے دوڑتے دیکھا تھا۔

اسی لئے تو ہیر پھیر کے سوالوں کا سہارا لیا تھا۔ براہ راست اظہار کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔

یہ تو وہم میں بھی نہیں تھا ۔۔۔ کہ وہ خود ہی یہاں تک آ پہنچی تھی۔

کبھی کبھار ایسا محسوس تو ہوتا کہ اُسے بھی اُس کا خیال ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحے سب اس کا بچپنا اور اپنی خوش فہمی سمجھ کر سر جھٹک دیتا ۔۔۔ اپنے اوپر افسوس ہوتا۔ اور ۔۔۔ اپنی عقل پر ماتم کناں۔

اُس نے ایک سرسری نظر مشعل پر ڈالی۔ وہ اب بھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

ایک دھیمی سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر بکھر گئی۔

کرسی پیچھے کھسکاتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اور ۔۔۔ خوبصورت سی دھن گنگناتا۔ باہر چل دیا۔

بوٹ ساحل سے لگ گئی تھی۔ شیر شاہ اترنے کی تیاری کر رہا تھا۔

مشعل اپنی شوپنگ کی ٹوکری لئے باہر نکل گئی۔

''میں چلتا ہوں نا ساتھ''۔ وہ اس کے پیچھے ساحل پر چلا آیا۔

''کس لئے؟'' وہ رُک سی گئی۔ اُس کے لہجے میں تیزی تھی۔

''تمہاری شوپنگ کرانے''۔

''نہیں ۔۔۔ میں خود کر سکتی ہوں''۔

''اچھا ٹھیک ہے شوپنگ کر لینے کے بعد اُسی دکان پر رہنا میں آ کر لے جاؤں گا''۔

''کہاں''۔

''واپس گھر''۔

''آپ تو شام تک یہیں رہیں گے ۔۔۔ میرا تو آپ بندوبست کریں گے''۔ اُس کے لہجے میں طنز تھا۔

''اوہ'' ۔۔۔ کیسی کیسی تلخ باتیں کرنا آ گئی تھیں اُسے۔ وہ بے بس سا مسکرا دیا۔ ''میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔ باقی کام بعد میں کر لوں گا''۔

''آپ ۔۔۔ میرا پیچھا چھوڑتے کیوں نہیں ہیں''۔ اس کے لہجے میں بلا کی بے حسی تھی۔

شیر شاہ کے چہرے پر تاریک سا سایہ لرز اُٹھا۔ وہ چاہتا تو اُسے زبردستی بھی روک سکتا تھا مگر اُس نے ایسا نہیں کیا۔ بوٹ کے آس پاس کیپٹن اور دوسرے ملازم منتظر کھڑے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی لیکن''۔ اُسے اس کی فکر تو بہر حال تھی۔ ''واپس کیسے جاؤ گی؟''

''کئی کشتیاں جاتی ہیں چلی جاؤں گی''۔ وہ آگے بڑھ گئی۔

چند ثانیے وہ اُسے جاتے دیکھتا رہا۔

پھر ۔۔۔ جانے کہاں سے؟ ایک مدھری مسکراہٹ اُس کے لبوں پر اُبھر آئی۔

اگر وہ پوچھ لیتا کہ اس اچانک کرو مزی کی وجہ کیا تھی؟

تو کیا وہ بتا دیتی کہ وہ اُسے پیار کرتی تھی اور کسی اور لڑکی کا ذکر برداشت نہیں کر پائی تھی؟ کبھی

نہیں ۔۔۔ وہ خوبصورتی سے ہنسا۔

پھر؟ کیا کرتی وہ؟ دل ہی دل میں یہی سوال دہراتا وہ اپنا بریف کیس لینے واپس بوٹ پر آیا۔

ایک طرف درخت کے سائے میں وین روک کر وہ نیچے اُتر آئی۔ تھک بھی گئی اور کچھ ـــ

آج موسم بھی بہت دلفریب ہو رہا تھا۔ اور گھٹائیں چھائی تھیں، سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا خنک تھی اور ـــ فضا میں جھومتی ہریالی کی مہک مستی لٹا رہی تھی۔

تھوڑی دیر وہ بلا مقصد ـــ ادھر اُدھر درختوں کے بیچ میں گھومتی رہی۔ پھر وین کے پاس آ کر کیلے نکالے، بونٹ پر رکھے اور وین سے ٹِک کر ـــ اطراف کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہوتی۔ مزے لے لے کر کھانے لگی۔

دفعتاً وہ قہقہوں کی آواز پر چونکی۔

مڑ کر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر ساحل کی طرف شیر شاہ چلا آ رہا تھا۔ ساتھ میں ستائیس اٹھائیس کے لگ بھگ ایک لڑکی تھی۔ مہمان تھی شاید ـــ جسے ایک دو روز قبل وہ ایئر پورٹ پر لینے جا رہا تھا۔

آتشی گلابی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس وہ گہرا میک اپ کیے تھی۔ دونوں اب بھی اردگرد سے بےخبر ہنستے ہوئے اُسی سمت چلے آ رہے تھے۔

مشعل کی اچانک تیوری چڑھ گئی۔ زور سے کیلے کو دانتوں سے کاٹا۔

مشعل۔ ان سے ملو یہ شازیہ ہیں"۔ دونوں پاس آ چکے تھے۔ شیر شاہ بڑے نرم انداز میں لڑکی کا اس سے تعارف کروا رہا تھا۔

مشعل کیلا کھاتے کھاتے رُک گئی۔

ایک کھا جانے والی نظر لڑکی پر ڈالی۔ غصہ سے شیر شاہ کو دیکھا۔

اور ـــ جیسے کچھ سُنا نہ ہو، دوبارہ کیلا کھانے لگی۔

"ہاؤ ڈو یو ڈو"۔ لڑکی نے بڑی ادا سے لمبے لمبے سیاہی مائل سرخ نیل پالش لگے ناخنوں والا ہاتھ آگے بڑھایا۔

اور ـــ سامنے دیکھتے ہوئے ـــ کیلے کا چھلکا ـــ دُور اچھال دیا۔

"ایسا نہیں کرتے"۔ شیر شاہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لڑکی کے آگے بڑھے ہاتھ کی طرف بڑھاتے ہوئے نرمی سے یوں بولا جیسے وہ واقعی چھوٹی بچی تھی۔ "ہاتھ ملاؤ ان سے"۔

مشعل نے شیر شاہ کا ہاتھ پوری قوت سے پرے جھٹک دیا۔

پٹی بندھا ہاتھ زور سے قریبی درخت کے تنے سے جا لگا۔

اور ـــ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے ٹانکے لگے زخم کا خون سفید پٹی کے اوپر ابھر آیا۔

مشعل ـــ دھک سے رہ گئی۔

"بدتمیز"۔ اچانک لڑکی بولی۔

اور ـــ مشعل کی آنکھوں میں وحشت اُتر آئی۔

آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ایک زناٹے دار تھپڑ لڑکی کے گال پر جڑ دیا۔

اس کی جھنجھلاہٹ، اُس کی تلخی، اس کی کرختگی کی وہ ہی تو ذمہ دار تھی۔

دونوں کو کوئی توجہ دیئے بنا۔ وہ آگے بڑھی اور وین سٹارٹ کر کے چلتی بنی۔

اُس نے منیجر کے یہاں انڈے دینے تھے، نہیں گئی۔ مالک کے یہاں بھی نہیں گئی۔ ورنہ آج اس کا خیال تھا ضرور جائے گی، پچھلے دو روز سے وہ شیر شاہ ہی کی وجہ سے نہیں گئی تھی۔

سارا موڈ ہی خراب ہو گیا تھا۔ سیدھی گھر واپس آ گئی۔

''آ گئیں بیٹا''۔ پھپھو اُسے دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے بولیں۔

''جی پھپھو''۔

''چلو بیٹا۔ منہ ہاتھ دھولو۔ آج کوفتے بنائے ہیں تمہاری پسند کے ___ کھیر بھی چاول کی''۔

وہ چپ چاپ کمرے میں چلی گئی۔ منہ ہاتھ دھوئے، کپڑے بدلے اور کھانے کی میز پر آ گئی۔ دونوں مختلف باتوں کے دوران کھانا کھانے لگیں۔

مگر ___ پھپھو کی دُوررس نظروں نے تاڑ لیا۔

مشعل معمول کے مطابق ہشاش بشاش نہ تھی۔ کھانے میں، باتوں میں اُن کا ساتھ ضرور دے رہی تھی ___ مگر ___ اندر ہی اندر جیسے کسی اُدھیڑ بُن میں مصروف تھی۔

''پولٹری سب جگہوں میں دے آئیں؟'' انہوں نے اُس کے ادھیڑ بُن کی وجہ براہ راست نہیں پوچھی۔

''اُ ___ ہاں ___ بس وہ منیجر رہ گیا اور...''۔

''اور کون؟''

''مالک''۔ جانے کیوں مالک کے لئے بھی اُس کے چہرے پر تحقیری اُبھر آئی۔ شیر شاہ سے منسلک تھا شاید اس لئے۔

پھپھو کی نظریں اُس کے چہرے پر ٹِک گئیں۔ کوئی بات تھی ضرور ___ مالک یا مالک کے آس پاس سے متعلق، آج تیسرا دن تھا وہ پولٹری دینے نہیں گئی وہاں۔

''مالک اس بات کا بہت خیال رکھتا ہے۔ خود تو جانے کچھ کھاتا بھی ہے یا نہیں۔ ایک اکیلا ہے، پر گھر داری بہت بڑی ہے اُس کی۔ مہمان تو جانے کہاں کہاں سے سمٹ کر آ پہنچتے ہیں...''۔

''مالک کا تو مجھے نہیں پتہ البتہ اُس شیر شاہ کی ضرور مہمان آئی ہوئی ہے''۔ تلخی کے ساتھ ساتھ مشعل کے لہجے میں تیزی بھی تھی۔

اور ___ پھپھو کے شُبے کو تقویت ملی۔

''تم ملی ہو اُس سے؟''

''ابھی کچھ دیر پہلے راستے میں ملے تھے دونوں''۔ اس کے لہجے سے غصہ عیاں تھا۔

اور ___ پھپھو ہولے سے مسکرادیں۔

پھر ___ کھانے میں مصروف ہوگئیں۔ پھر ___ جیسے کچھ سوچنے لگیں۔

''ویسے ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آئی۔ وہ اچانک پر جلال نظر آنے لگیں۔ ایک عورت کسی مرد کی مہمان بن کیسے جاتی ہے؟ وہ بھی دُور پار اس جزیرے میں''۔

''عورت نہیں لڑکی تھی ___ وہ بھی خوب بڑی ساری''۔

''تو اس خوب بڑی ساری کو کیا لینا دینا ایک جوان مرد سے بتاؤ''۔

مشعل الجھی الجھی سی کھانے میں مصروف رہی۔ بولی کچھ نہیں۔

''اسے جا کب رہی ہے واپس؟'' وہ چشمہ آنکھوں پر درست کرتے ہوئے پھر بولیں۔

''مجھے کیا پتہ''۔

''اسے پوچھا تو ہوتا۔ زہر لگتی ہیں مجھے ایسی مہمانیں''۔

''مجھے کیا ضرورت تھی پوچھنے کی''۔ کرسی پیچھے کھسکا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

اور ___ پھپھو کے مزید کچھ کہنے سے قبل ___ اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

پھپھو پھر سے کھانا کھانے لگیں۔ کبھی کچھ سوچنے لگ جاتی اور کبھی آنکھیں کسی خوش آئند تصور کے تحت چمک اٹھتیں۔

شام کو وہ درزن کے یہاں اُس کی بہو اور بچے کو دیکھنے جانے لگیں تو مشعل کو بھی ساتھ

لے گئیں۔ منے سے بچے کو گود میں لے کر مشعل بہت حد تک بہل گئی۔

"بیٹا آج مالک کے یہاں مرغیاں [illegible] ضرور دینا۔ [illegible] پہلے تو وہیں جانا۔ [illegible] ضرورت پڑتی ہے"۔ وہ حسبِ معمول جانے [illegible] تیار ہوئی تو پھپھو نے یاد دلایا۔

پھپھو جانتی تھیں مالک اتنے دن کے [illegible] کا متحمل نہیں ہو سکتا [illegible]۔ [illegible] صرف مشعل کی وجہ سے۔

"اچھا پھپھو۔ سیدھی وہیں چلتی ہوں"۔ [illegible] مالک کی ہی دست [illegible] مشعل جانتی تھی۔ اور اب تک جو اس نے کوتاہی برتی تھی [illegible] اسے افسوس بھی ہو رہا تھا۔

"ہاں بیٹے جلدی جانا"۔ پھپھو دروازے [illegible] اس کے ساتھ آ گئیں۔

اور ــــ وہ واقعی سیدھی مالک کے یہاں چلی۔

وہ شیر شاہ کا گھر نہیں تھا۔ عارضی طور پر [illegible] مالک کے یہاں ــــ

وہ کیوں اُسے اتنی اہمیت دے رہی تھی۔

اہمیت؟ وہ چونکی۔

اہمیت تو وہ اُسے دیتی تھی۔ جبھی تو اس کے ساتھ لڑکی دیکھ کر اُسے اتنا سارا غصہ آیا تھا۔

جبھی تو جب وہ اس کا ہاتھ لڑکی سے ملانے لگا تھا تو اس نے اس کا وہی ہاتھ زور سے جھٹک دے مارا تھا۔

سوچتے ہی اس وقت وہ پھر بیقراری ہوگئی۔کل سے برابر سفید پٹی پر ابھرتے سُرخ سُرخ
خون کے دھبے اس کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ ہر بار وہ بے چین ہو جاتی، بے کل ہو جاتی۔
بے کل تو وہ اُس وقت بھی ہوئی تھی جب اسے چھری لگی تھی۔ایک تڑپ سی محسوس کی تھی اُسے
تکلیف میں دیکھ کر ___ تب وہ اسے کتنا اچھا لگا تھا۔

مگر ___ جب اُس نے ایک فرینڈ کے آنے کی خبر سنائی تو وہ سب بھول گئی تھی۔ مارے
غصّے کے آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا پیٹ ڈالے اُسے۔

پھر کل ___ کل تو اُسے نفرت ہونے لگی تھی اس سے۔دل چاہتا تھا منہ نوچ لے اس
کا ___ مار ڈالے اُسے۔

مگر ___ جوں ہی اُس کے زخمی ہاتھ پر باندھی پٹی پر خون کے دھبے ابھرتے دیکھے۔دل
بیٹھ سا گیا۔

کیا تھا یہ سب؟

کبھی اس قدر نفرت! کبھی اتنی زیادہ اپنائیت!

سوچوں میں اُلجھی ___ وہ گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔وین ایک طرف رکی۔

''آپ کو مالک نے یاد کیا ہے''۔لپک کر ملازم پاس چلا آیا۔

''مجھے؟'' وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔

''جی۔کہتے تھے جوں ہی آپ آئیں میں آپ کو ان کے پاس لے چلوں۔آیئے''۔

وہ ساتھ ہولی۔یقیناً پھپھو کے لئے کوئی پیغام تھا۔

''تمہارے مالک آج بڑی جلدی جاگ گئے ہیں''۔ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ کہنے لگی۔

''جی ہاں بہت سویرے کے جاگ رہے ہیں''۔وہ مؤدب طریق سے بولا۔

اُس کے پہلے دن کے اور آج کے رویّے میں نمایاں فرق تھا۔شاید جان گیا تھا کہ وہ کوئی

ڈرائیور وغیرہ نہیں تھی۔

''وہ سامنے کمرہ ہے آپ تشریف لے جایئے''۔ملازم سیڑھیوں کے اختتام پر ہی رک
گیا۔

وہ لاؤنج میں آگے بڑھی۔تو وہ واپس چل دیا۔

''ٹھک ٹھک''۔اس نے دستک دی۔

''یس ___ COME IN''۔بھاری سی آواز آئی۔

اور ___ دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی۔

وسیع کمرے میں نیلے رنگ کا قیمتی دبیز قالین بچھا تھا۔نیلے پھولدار پردے ایک طرف
ہٹائے گئے تھے۔ایک طرف نیلے ہی رنگ کا جدید طرز کا دیدہ زیب صوفہ لگا تھا۔اوپر دیوار پر
بیش قیمت پینٹنگ آویزاں تھی۔سامنے قد آدم آئینہ لگا تھا۔اور ___ ان گنت قرمزی پھولوں
سے لدی خوبصورت بالکنی کی اوٹ میں لگا چوڑا اور نفیس بیڈ تھا۔

اور ___ شاید مالک ___ اُس پر بازوؤں کے حلقے میں سر لئے اوندھا لیٹا تھا۔

وہ کچھ ___ جھجک کر رُک گئی۔

معاً ___ وہیں بستر پر پڑے پڑے، اوندھے ہی لیٹے۔اُس نے رُخ اس کی طرف کر لیا۔

یہ تو ___ شیر شاہ تھا۔

اس کی ساری جھجک ختم ہوگئی۔مگر ___ جھجک کی جگہ اب ___ شرمندگی نے لے لی۔کل
اُس نے کیسے اس کا زخمی ہاتھ درخت سے دے مارا تھا۔

مگر ___ وہ بھی تو اُس لڑکی کو ساتھ لئے قہقہے لگا رہا تھا۔

شرمندگی کے ساتھ اب خفگی بھی گھل مل گئی۔

وہ وہیں ___ الماری سے ٹک کر کھڑی ہوگئی۔

"آؤ"۔ وہ نرمی سے بولا۔ اُس کی شرمندگی اس کی خفگی کچھ بھی تو اس سے چھپا نہیں تھا۔

گو ـــ کل اس کے بھی دل میں اُس سے گلہ پیدا ہوا تھا۔ اُس نے اُس کی مہمان کی بے عزتی کی تھی، اُسے شرمندہ کروایا تھا، شازیہ سے معافی مانگنی پڑی تھی اُسے ـــ مگر ـــ

بعد میں جانے کیوں؟ سب معدوم ہو گیا۔ یا تو وہ خود مشعل کو بے حد چاہتا تھا یا پھر مشعل اُسے اُس سے بھی بڑھ کر پیار کرتی تھی۔

جبھی تو شازیہ کو اُس کے ساتھ برداشت نہ کر پائی تھی، تبھی تو جھپٹ پڑی تھی اُس پر۔

اُسے اچانک خوبصورت، نیلگوں آنکھوں والی پشمینی سی بلی کا خیال آ گیا۔ پرکشش لب دھیرے سے مسکرا دیئے۔

وہ اب بھی وہیں کھڑی ناراض ناراض نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

"آؤ نا"۔ اُس نے پھر کہا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔

"بیٹھو"۔ اُس نے اپنی مسہری کی پٹی کی طرف اشارہ کیا۔

اور ـــ وہ بیٹھ گئی۔ اُس نے دیکھا۔ اُس کے دلکش خدوخال مضمحل تھے، دلنشیں آنکھوں میں سُرخ ڈورے بہت نمایاں تھے۔

"کہو۔ کیسے آنا ہوا؟" اُس کی بھاری آواز میں شرارت کی جھلک تھی۔

"اوہ"۔ اُسے جیسے اچانک خیال آیا۔ "مجھے تو ـــ مالک نے بلایا تھا"۔

وہ ہنس دیا۔ نڈھال سا۔

"مالک نے؟ اوہ اچھا۔ پولٹری جو نہیں ملی اتنے دن..."۔

"کہاں ہے وہ؟"

"اس کا پاس ـــ والا کمرہ ہے ـــ مگر ـــ وہ تو دوسرے جزیرے پر کام سے چلا گیا

ہے..."۔

"پتہ نہیں کیا کہنا تھا اُس نے؟" وہ پریشان سی بولی۔

"یہی کہ ـــ بچارا بھوکا رہ گیا ہے"۔ مشعل کی بہت پہلے کی بات دہراتے ہوئے دھیرے سے مسکرایا۔ "صبح بھی یہی شکایت کر رہا تھا، یقیناً آنٹی کو یہی کہلوانا چاہتا ہوگا"۔ نیم وا تھکی تھکی آنکھیں اُس پر جمائے وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔

"ہاں ـــ یہی ہو سکتا ہے"۔ وہ معصومیت سے بولی۔

اور ـــ وہ ہولے سے ہنس دیا ـــ تھکی تھکی، مضمحل سی ہنسی۔

"اچھا"۔ وہ اب بھی سر بازوؤں کے حلقے میں لئے تھا۔ "تو تم مالک کا پیغام سن کر آئی تھیں۔ میں سمجھا مجھے دیکھنے آئی..."۔

وہ کچھ ـــ چپ سی نظر آنے لگی۔

"وہ ـــ وہ چلی گئی؟" اپنے ناخنوں کو تکتے ہوئے اس نے آہستہ سے پوچھا۔ اب کے اس کے لہجے میں شکوہ سا تھا، شکایت سی تھی۔

شیر شاہ سمجھ گیا اس کا اشارہ شازیہ کی طرف تھا۔

ایک نظر اُسے دیکھا۔ سلیٹی رنگ کی کاٹن پر مرون رنگ کے چھوٹے چھوٹے ان گنت بھالوؤں والے ڈریس میں سر جھکائے بیٹھی ـــ وہ بہت چھوٹی لگ رہی تھی۔ مُنی سی، گڑیا سی۔

"ہاں ـــ آج صبح چار بجے چلی گئی"۔

مشعل کی جھکی پلکیں اٹھیں۔ نظروں میں شکوک سے اُبھرے۔

"تو جبھی آپ جاگ رہے ہیں اس وقت"۔ پہلی بار وہ یہاں آئی تھی تو آج کی نسبت کافی لیٹ تھی اور تب وہ سو رہا تھا۔

اور ـــ اُس نے گہری سانس لی۔

"یہ تکیئے ذرا ٹھیک سے رکھو"۔ کہنیوں کا سہارا لیتے ہوئے اس نے سر قدرے اوپر اٹھایا۔
مشعل نے اٹھ کر تکیے مسہری کی پشت سے لگا دیئے۔

اُس نے ___ جیسے کوشش کر کے سیدھا ہوتے ہوئے۔ تکیوں سے پشت ٹکالی۔

"مجھے بخار ہے کل سے"۔ اُس نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے دوبارہ اپنے قریب مسہری پر بٹھا لیا۔ "ساری رات نیند نہیں آئی ٹھیک سے۔ اس لئے جاگ رہا ہوں اِس وقت"۔

"اوہ"۔ شکوک معدوم ہوگئے۔ یکدم ہی ڈھیر سارا کرب ابھر آیا آنکھوں میں ___ تڑپ سی بھر گئی نظروں میں۔

وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا ___ غور سے ___

"کیوں بخار ہوا ہے؟" نیلگوں آنکھوں میں کرب اور تڑپ دھواں دھواں ہونے لگے۔

"تم نے ہاتھ درخت سے دے مارا تھا نا"۔ وہ اپنے پٹی ہوئے ہاتھ کو دیکھتے دیکھتے کہنے لگا۔ "دوبارہ خون رسنے لگا تھا، پھر SEPTIC ___ ہوگیا ___ سو بخار آنے لگا"۔

بڑی دیر کا منڈلاتا دھواں ___ اُس کی آنکھوں کو نم کر گیا۔ اور آبی موتی اس کے گلابی گالوں پر آ رہے۔

"اے"۔ اُس کی اچانک نظر پڑی۔ جلدی سے موتی انگلیوں پر اٹھا لئے۔ "یہ کیا کر رہی ہو"۔

پر ___ جانے کیا ہوا اُسے؟ بازو آنکھوں پر رکھ کر وہ بچوں کی طرح رو دی۔

"نہیں"۔ اس کا بازو ہٹاتے ہوئے اُس نے اس کا سر سینے سے لگا لیا۔ "اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ بخار ٹھیک ہو جائیگا..."۔

اس کی تو ہر بات، ہر کام بچوں والا تھا۔

بے اختیار اُس کے ہونٹ اُس کے ماتھے پر ٹک گئے۔

دفعتاً ___ مشعل سیدھی ہو بیٹھی۔

اور ___ شیر شاہ ___ چونک سا گیا۔

اس کے پیار کر لینے پر جانے کیا ردعمل ہونے والا تھا اس کا؟

اُسے اچانک لگا ___ اُس نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔

مگر ___ مشعل نے ہاتھ سے ماتھا پونچھا۔

آنسوؤں کے درمیان مسکرائی۔

"میں کوئی بچی ہوں کہ آپ مجھے پیار کر رہے ہیں"۔ وہ سادگی سے بولی۔

اور ___ شیر شاہ کا دل چاہا ___ سر پیٹ لے۔

اُسے کیا کیا اندیشے تھے۔ اور ___ وہ کیا سمجھ بیٹھی تھی۔

"میں کوئی بچہ تھا جب تم نے بوٹ پر میرے ہاتھ پر پیار کیا تھا"۔ وہ جل کر بولا۔

اور ___ وہ روتے روتے چپ ہوگئی۔

ایک بار پھر ___ الجھی الجھی سی نظر آنے لگی۔

"میں ___ مجھے آپ کی تکلیف پر..."۔ وہ انگلیوں کی پوروں سے نم گال پونچھنے لگی۔

اور وہ ___ اور بھی جل گیا۔

"میں نے بھی تمہاری تکلیف پر تمہیں پیار کیا تھا"۔

"مجھے کیا تکلیف ہے"۔ وہ آنسوؤں کے درمیان ہنس دی۔

"تو پھر رو کیوں رہی ہو"۔

اُس کے لب و لہجے پر وہ سہم سی گئی۔

"آپ ___ کو بخار ہے نا"۔

"بخار تو تمہارے ملازم کو بھی تھا"۔

اور ___ وہ اچانک کھلکھلا کر ہنس دی۔

"اس کے لئے میں روؤں گی"۔

"تو میرے اوپر کیوں خاص مہربانی ہے"۔ اس کا لہجہ جھنجھلایا ہوا تھا۔

اُس کی ہیر پھیر کی باتوں اور جھنجھلاہٹ پر وہ پھر سے رو دی۔ پھر سے بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

اور شیر شاہ نے گہری سانس لی۔ چند لمحے اُسے الجھا الجھا سا دیکھتا رہا۔

"تم ___ واقعی کچھ نہیں سمجھتی ہو؟"

"سمجھتی ہوں"۔ اُس نے روتے روتے کہا۔

"کیا"؟۔ اُس کے لہجے میں تحکم تھا۔

"کہ ___ آپ اچھے ہیں"۔ بازو اب بھی اس کی آنکھوں پر تھا۔

"بس اچھا ہوں؟" وہ پھر الجھنے لگا۔

"بہت اچھے ہیں"۔

اور ___ اُس نے پھر گہری سانس لی۔

"یہ بازو ہٹاؤ"۔ اس نے اُس کی آنکھوں پر سے بازو ہٹالیا۔ "اب بتاؤ"۔

"کیا؟"

اور ___ وہ سمجھ گیا۔ وہ یوں آسانی سے سمجھنے والی نہیں تھی۔

"میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟" اس نے براہ راست پوچھا۔

"ٹھیک لگتے ہیں"۔ اس کے روّیے کی سنجیدگی اور لہجے کے دبدبے سے وہ سہم کر بولی۔

اور ___ سہمی سہمی سی اُس ننّھی سی لڑکی پر اُسے ترس آ گیا۔

اُسے اپنے روّیے کا، لہجے کا احساس ہو گیا۔

"بخار تو مجھے اب بھی ہے"۔ وہ اچانک نرمی سے بولا۔

اور وہ ___ بھیگی آنکھیں لئے مسکرا دی۔

"بتاؤ نا میں تمہیں کیسا لگتا ہوں"۔ اُس نے اپنائیت سے اپنا سوال دہرایا۔

"اچھے لگتے ہیں"۔

"اس اتنی سی بات کے لئے تم نے مجھے کتنا پریشان کیا ہے"۔

"آپ مجھے اچھے لگتے ہیں مگر ___ وہ لڑکی مجھے اچھی نہیں لگتی تھی"۔

وہ ___ واقعی بہت معصوم تھی۔

"کیوں اچھی نہیں لگتی تھی"۔ جانے کیوں؟ وہ اُس کی زبان سے سننا چاہتا تھا ___ بہت کچھ ___ جو اُس سے متعلق ہو۔

"اس لئے ___ کہ وہ آپ کو اچھی لگتی تھی"۔ اس کے لہجے میں جہاں بھر کے شکوے تھے، شکائتیں تھیں۔

"نہیں۔ مجھے تم اچھی لگتی ہو"۔ اس کا ہاتھ اٹھا کر اُس نے ہونٹوں سے لگالیا۔ "اور کوئی اچھا نہیں لگتا"۔

"پھر وہ لڑکی؟"

"مہمان تھی۔ یہاں اکثر لوگ مجھے وطن سے ملنے آ جاتے ہیں، سیر کرنے..."۔

"مگر وہ ___ سیر کرنے نہیں آئی تھی"۔

وہ مسکرا دیا۔

"کبھی تم بہت ہوشیاری کی باتیں کرتی ہو اور کبھی ___ کچھ نہیں سمجھ پاتیں"۔

"وہ لڑکی سیر کرنے نہیں آئی تھی"۔ وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔

"ہاں۔ وہ مجھ سے ملنے آئی تھی ___ مگر ___ مجھے اس سے ایسی کوئی دلچسپی نہیں ہے"۔

"پھر ـــــ قہقہے کیوں لگا رہے تھے اس کے ساتھ؟" وہ شاکی انداز میں بولی۔

وہ ـــــ اب بھی ہنس دیا۔

"وہ تو ـــــ غیر ارادی چیز ہے۔ تمہیں اچھا نہیں لگا تو آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ ٹھیک"۔

"آئندہ ہوا ـــــ تو ـــــ منہ نوچ لوں گی آپ کا۔ مار ڈالوں گی..."۔

"باپ رے ـــــ مجھے تو تم سے ڈر لگنے لگا ہے"۔

اور ـــــ مشعل کھلکھلا کر ہنس دی۔

"اچھا بتاؤ ـــــ مجھے کتنا پیار کرتی ہو؟"

"پیار؟" چونک کر ـــــ وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"جناب"۔ وہ بڑے انکسار سے بولا"۔ تمہارے خیال میں اتنی دیر سے سب کیا ہو رہا ہے"۔

"نہیں"۔ وہ جیسے گھبرا کر بولی۔

"کیوں؟" وہ حیرت سے پوچھنے لگا۔

"وجہ... میں ـــــ اتنی ـــــ اور ـــــ" اُس نے یکدم ہی چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

اور ـــــ نرالی اداؤں سے محظوظ ہوتا ـــــ وہ مسحور سا مسکرا دیا۔

تو ـــــ اب تک ـــــ وہ یہ سب۔ بس یوں ہی سمجھ رہی تھی!

"سنو"۔ اس نے اس کے چہرے سے اس کے ہاتھ ہٹائے۔

اس کا چہرہ کانوں کی لوؤں تک سُرخ ہو رہا تھا۔ لانبی سیاہ پلکیں کسی طرح اوپر اٹھنے کا نام نہ لے رہی تھیں۔

"نہیں"۔ اس انوکھے انکشاف پر وہ اب بھی احتجاج کر رہی تھی۔

اس نے دھیرے سے اُسے بازوؤں میں بھر لیا۔ آہستہ سے سینے سے لگا لیا۔

"ہاں ـــــ تم واقعی مجھے پیار کرتی ہو۔ میں بھی ـــــ تمہیں چاہتا ہوں۔ بہت زیادہ۔ بے اندازہ ..."۔ اُسے پیار کرتے کرتے وہ کہتا گیا۔

تبھی ـــــ نیچے ـــــ گیٹ کے پاس باتوں کی آواز پر وہ چونکا۔

محتاط ہوا۔ مشعل کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ چند ثانیے اُس کی بند بند آنکھوں میں دیکھا۔

"ویسے ـــــ نام کیا ہے تمہارا؟" اس کے ماتھے پر سے بالوں کی بے ترتیب لٹ ہٹاتے ہوئے وہ یوں بولا جیسے واقعی اس کا نام نہ جانتا ہو۔

"مشعل"۔ اس نے معصومیت سے کہا۔

اور ـــــ دو نیلی مشعلوں کی لپٹیں اُس کی ہستی کے آر پار ہونے لگیں۔

وہ بے بس سا مسکرا دیا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" جانے کیسے؟ اُس نے پوچھ لیا۔

اوہ۔ کتنی کیوٹ تھی، بدلہ لینا بھی جانتی تھی۔

وہ مسحور سا ہوا۔

"شیر شاہ"۔

وہ بھی اُس کا نام جانتی تھی ـــــ اور اپنے نام ہی کی طرح اس کی مضبوطی، دلیری اور بے باکی بھی۔

"ویسے آپ نے ائیر پورٹ پر اپنا تعارف نہیں کروایا تھا"۔ یہ خیال اُسے پہلے بھی آیا تھا۔

وہ ـــــ اچانک زور سے ہنس دیا۔

"چاہتا تھا کہ کراؤں۔ مگر بائے گوڈ تمہیں دیکھ کر ارادہ بدل دیا..."۔

"کیوں؟"

"میں گیا تھا ریسیو کرنے ایک سولہ، سترہ سال کی لڑکی کو۔ وہ نکلی چھ سات سال کی بچی۔ جو

تھی۔ کون گیا کون آیا کبھی ذہن پر بوجھ ہی نہیں ڈالا تھا۔ صبح اٹھتے ہی پہلی نظر سامنے لگے کیلنڈر پر ڈالتی۔

جوں توں کر کے پندرہ دن گزر گئے تھے، مگر پورے پندرہ دن اب بھی باقی تھے شیر شاہ کے آنے میں۔

وہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھتی ـــ مگر ـــ خوبصورت چہرے پر چھائی چُپ کی چھاپ برقرار تھی۔

''اے بیٹا شیر شاہ کچھ کہہ کے گیا ہے کب دوبارہ آئے گا؟'' دوپہر کے کھانے پر پھپھو بولیں۔

مشعل اپنے تئیں اُن سے سب چھپا رہی تھی۔ مگر اُن کی دُوررس نگاہیں بہت پہلے سب تاڑ گئی تھیں۔ وہ جانتی تھیں آج کل مشعل کیوں چپ چپ سی رہتی تھی۔ پھر۔ اُن کے دل کو خود بھی تو دھڑکا سا رہنے لگا تھا۔ اُس کے معصوم دل کو ٹھیس پہنچے وہ تصور بھی کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ تو تہہ دل سے خواہش مند تھیں شیر شاہ مشعل کو اپنا لے۔ شیر شاہ بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ اور پھر ـــ وہ بھی اتنی بڑی ذمہ داری سے بخوبی عہدہ برآ ہوتیں۔ لیکن ـــ اگر ایسا نہ ہوا ـــ اُس نے محض وقت گزاری ہی کی ہو تو؟ گو لگتا ہے وہ ایسا نہیں تھا ـــ مگر ـــ پھر بھی ـــ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ وہ پریشان ہو جاتیں سوچ کر۔

''جی پھپھو کہتا تھا کہ ایک ماہ بعد پھر آئے گا''۔ وہ آہستہ سے بولی۔ اب تو وہ اونچ نیچ سمجھنے لگی تھی۔ پھپھو سے شیر شاہ کے ذکر پر اُس کی نظریں خود بخود جھک جاتیں۔

اور ـــ پھپھو مطمئن ہو کر مسکرا دیں۔

''دیکھو جاتے ہوئے میرے پاس آیا تھا مگر مجھے نہیں بتائی یہ بات''۔

مشعل کے چہرے پر لالی سی بکھر گئی۔ خاموشی سے کھانے میں مصروف رہی۔

''ویسے وہ چھ ماہ سے پہلے چکر نہیں لگاتا''۔ پھپھو مسکراتے ہوئے دوبارہ بولیں۔

''پھپھو چاول لیں۔ ٹھنڈے ہو رہے ہیں''۔ مشعل نے بات بدلنے کی خاطر کہا۔

پھپھو نے چاول پلیٹ میں نکالے، اوپر سے دال ڈالی اور کھانے لگیں۔

''بیٹا کل ماہی گیروں کا دن منایا جائے گا۔ یہ تمام جزیروں میں ایک روایتی جشن کے طور پر دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ تمہیں لے کر جاؤں گی پرلے جزیرے پر۔ وہاں زیادہ رونق ہوتی ہے۔ تمہارے لیے نئی چیز ہوگی، بڑا شور شرابا ہوتا ہے''۔

''ضرور چلیں گے پھپھو''، مشعل خوش ہو کر بولی۔

باقی کا دن اُس نے آنے والے کل کے انتظار میں خوشی خوشی گزار دیا۔

اگلے دن پھپھو اُسے کشتی میں لے کر پرلے جزیرے پر گئیں۔ واقعی بڑی رونق تھی۔ جزیرے کے اندر بھی، باہر بھی۔

سمندر کے ساحل پر جگہ جگہ سائبان بنے تھے، سٹالز لگے تھے، ریڑھیوں پر طرح طرح کی جیولری سجی تھی، کھانے پینے کی چیزیں بک رہی تھیں۔ کہیں چھوٹے سے سٹیج پر گانا اور رقص ہو رہا تھا، لوگ اردگرد مجمع لگائے کھڑے تھے۔ سمندر میں کشتیوں کے غول کے غول آ جا رہے تھے۔ شوخ رنگوں کی بہار تھی، ہنسی اور قہقہے تھے۔ زندگی ہی زندگی تھی۔

وہ بچوں کی طرح خوش ہو ہو کر مختلف سٹالز پر گھومتی رہی۔ ایک چکر جزیرے کے اندر بھی لگایا۔ تھک تھکا کر شام ہونے سے پہلے دونوں لوٹ آئیں۔

مگر ـــ آج کا دن جتنا خوش خوش گزارا تھا۔ اگلا دن اُس کے لئے اتنا ہی اداسیاں، پریشانیاں لے کر آیا۔

دوپہر کو کام سے لوٹ کر وین احاطے میں کھڑی کرتے ہی وہ سیدھی کھانے کی میز پر آئی۔

پھپھو پہلے سے منتظر بیٹھی تھیں۔ دونوں کھانا کھانے لگیں۔

"بیٹا رحمت بھیا کا خط آیا ہے میرے پاس"۔ قدرے توقف کے بعد پھپھو کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

"اچھا۔ کیا لکھا ہے؟"

"باورچی خانے میں رکھا ہے کھانے کے بعد پڑھ لینا"۔ وہ اب بھی کچھ سوچ رہی تھیں۔

"بس میں نے کھا لیا ہے"۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کہاں رکھا ہے؟"

"کونے کی میز پر"۔

اور ـــ جا کر وہ باورچی خانے سے خط اٹھا لائی۔ لفافے میں سے نکالنے لگی۔

"کمرے میں جا کر تسلی سے پڑھ لینا"۔ پھپھو نے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

اور وہ خط لئے کمرے میں آ گئی۔

ہاتھ دھو کر۔ اطمینان سے بستر پر لیٹی۔ اور خط پڑھنے لگی۔

"... خوشخبری کی بات ہے۔ بیرسٹر صاحب آئے تھے کہتے تھے خان صاحب نے کوٹھی مشعل بی بی کو واپس کر دی ہے۔ تمام کاغذات بیرسٹر صاحب کے سپرد کر دیئے ہیں۔ خان صاحب چاہتے ہیں کہ مشعل بی بی واپس آ کر اپنی کوٹھی میں رہیں۔ اور ہاں ایف۔ اے کا نتیجہ بھی آ گیا ہے۔ مشعل بی بی پاس ہو گئی ہیں۔ ایک اور بات بڑے راز کی ہے۔ وہ یہ کہ خان صاحب مشعل بی بی سے شادی کے خواہشمند ہیں۔ سنا ہے کہ یہ اپنے صاحب مرحوم کی بھی خواہش

آگے کیا لکھا تھا؟ مشعل نے پڑھا ہی نہیں۔

غصے میں پاگل ہوتی پھپھو کے کمرے میں گئی۔

"پھپھو کیا ہے یہ سب؟"

"میرا تو خود دماغ کام نہیں کر رہا۔ تمہیں خط اس لئے دکھا دیا کہ شاید تمہیں کچھ علم ہو، اندازہ ہو ان باتوں کا ـــ مجھے تو عرصہ ہوا بھائی صاحب سے ملے..." وہ بستر میں اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہنے لگیں۔

"پھپھو یہ سب غلط ہے۔ پاپا کی ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔ یہ سب ایک پلان ہے، فراڈ ہے۔ ہمارا سب کچھ چھین کر اب مجھے ـــ میرے بارے میں سوچنے لگا ہے۔ اس ذلیل کی یہ ہمت کیسے ہوئی۔ میں بھی حیران تھی کہ اتنا ہمدرد کیوں بن رہا ہے کہ کہتا ہے کہ کوٹھی اب بھی مشعل کی ہے میں تو صرف رکھوالی کرنا چاہتا ہوں۔ ہونہہ! کوٹھی کی بھی اور میری بھی"۔ وہ غصے میں بڑبڑاتی رہی۔

"بیٹھو میرا بچہ"۔ پھپھو نے اسے اپنے پاس بستر پر بٹھا لیا۔ "حوصلہ کرو، صبر سے کام لو۔ میں آج ہی خط لکھتی ہوں بیرسٹر صاحب کو، پوچھتی ہوں کہ کیا یہ سب...؟"

"اور یہ دیکھیں کہ کیسے کوٹھی مجھے واپس کر کے کاغذات بیرسٹر انکل کے سپرد کر دیئے ہیں۔ یعنی اُن کو بھی اعتماد میں لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں حیران ہوں یہ کمینہ چاہتا کیا ہے اور میرا نام کیسے لے رہا ہے؟ ہمت کیسے ہوئی اس کی؟"

"میں سب پتہ کروں گی۔ تم فکر مت کرو۔ ارے تمہاری مرضی کے بغیر کوئی کچھ کر سکتا ہے بھلا"۔ انہوں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ انہیں معلوم تھا وہ شیر شاہ کو پسند کرتی تھی۔ کسی اور کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ "میرا تو خیال تھا کہ شاید تمہیں کچھ معلوم ہو کچھ سُنا ہو بھائی صاحب سے ـــ شاید ہو کوئی ایسی بات، ایسا شخص جہاں ان کی واقعی مرضی ہو۔ خواہش ہو..."۔

"پھپھو کیسی بات کرتی ہیں آپ۔ اُن کی خواہش اپنے دشمن کے یہاں ہو گی۔ اور پھر ـــ اتنی عمر کے آدمی کے ساتھ"۔ اس کا اندازہ تھا وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ "یہ بھی ہمیں نیچا دکھانے کی ایک سکیم ہے۔ مجھے حیرت ہے اس شخص کی پیاس بجھتی بھی ہے یا نہیں؟ جانے پاپا نے

"کیا بگاڑا تھا اس کمبخت کا؟" بالآخر وہ ___ رو دی۔

"رو نہیں میری بچی"۔ پھپھو کی بھی آنکھیں بھر آئیں۔ کیسے کیسے عذاب جھیل رہی تھی چھوٹی سی جان۔ "کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ تمہاری مرضی نہیں ہوگی تو کوئی ایک قدم بھی تمہاری طرف بڑھ نہیں سکتا۔ کوئی مذاق ہے ___ بھلا سنو تو۔ میں عورت ذات سہی پر لڑوں گی تمہاری خاطر۔ آخری دم تک ہاں ___ میں بھی ہاجرہ سراج ہوں..."۔ پھپھو جلال میں آ گئیں۔ آنکھیں ساڑھی کے پلو سے زور سے رگڑ ڈالیں۔ "بھلا بات ہے۔ میرے بھائی کے گھر کی ہر چیز پر نظر رکھے ہے۔ آنکھیں نہ پھوڑ دوں کمبخت کی۔ اٹھ میرا بچہ دفع کر اس بات کو۔ اچھی باتیں سوچ۔ تم پاس بھی تو ہوئی ہو۔ مٹھائی بھی منگوانی ہے۔ اور پھر ___ ککڑ خانے میں چل کر دیکھو۔ درمیان والی کوٹھڑی میں مرغیوں نے بچے دیئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے سے، پیارے پیارے سے اٹھو"۔ اور وہ ننھے بچوں کی طرح مشعل کو بہلا پھسلا کر باہر مرغی خانے کی طرف لے آئیں۔

دن کو تو پھپھو جلال میں آ گئی تھیں۔ باقی کا وقت بھی طرح طرح کے منصوبے بناتی بگاڑتی رہیں۔ مگر ___ رات آئی۔ تو پریشان ہو اٹھیں۔

یہ آدمی تو واقعی بھائی صاحب کے گھر کا صفایا کرنے پر تل گیا تھا۔ بلا قیمت ادا کیے کوٹھی مشعل کو واپس کر دینے کا مطلب ہی یہی تھا کہ وہ مشعل کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اُن کا دل دھک سے رہ گیا۔ اٹھ کر بستر میں بیٹھ گئیں۔

ضرور کہیں کمبخت کی نظر پڑی تھی مشعل پر ___ مر مٹا تھا اس کی صورت پر۔

مگر ___ مُوا ___ اپنی بھی شکل دیکھی تھی کبھی آئینے میں۔ دانت بھی پتہ نہیں ہیں منہ میں یا نہیں؟

کچھ غصہ، گھبراہٹ ___ اٹھ کر انہوں نے بتی جلائی۔

پانی پیا۔ کچھ ہمت بندھی۔ کاغذات اور قلم نکالا۔

اور دوبارہ بستر میں بیٹھ کر بیرسٹر صاحب کو خط لکھنے لگیں۔

"... عجب اندھیر ہے بیرسٹر صاحب۔ آپ فوراً کوٹھی کے کاغذات اُس موئے خان کو واپس کر دیں۔ ہم خود کوٹھی واپس لیں گے انشاء اللہ، اس کی ایک ایک پائی چکا کر ___ مفت لے کر بدلے میں مشعل کا سودا نہیں کریں گے۔ ہم نے لکھ دیا بس۔ کہہ دیں اُس خان سے کہ آئندہ مشعل کا نام اپنے پوپلے منہ پر لایا تو لتاڑ رکھ دوں گی..."۔

خط لفافے میں ڈال کر اور بیرسٹر صاحب کا پتہ لکھ کر انہیں ایک گونہ اطمینان ہوا۔

خط اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر وہ پھر سے لیٹ گئیں۔ سونے کی کوشش کی مگر بے سود ___ ایسے میں انہیں شیر شاہ کا خیال آ گیا۔

اور پھر ___ وہ کہنی کے بل لیٹ کر باقاعدہ سوچنے لگیں۔

شیر شاہ کے آتے ہی وہ اُس سے صاف بات کریں گی۔ مشعل کو چاہتا ہے تو اپنا لے جلدی سے۔ مشعل کو اس کا پیار بھی مل جائے گا۔ اور ان کی ذمہ داری ___ جو اب باقاعدہ پریشانی میں بدل گئی تھی، نمٹ جائے گی۔

یہ سوچتے ہی ان کا ذہنی تناؤ جاتا رہا ___ دل کو تقویت سی ملی۔

اور ___ پھر ___ آہستہ آہستہ ___ نیند نے آلیا۔

اپنے سیاہ گھنے مختصر سے بالوں پر جلدی جلدی برش پھیرتی وہ ناشتے کی میز پر آ گئی۔ پھپھو پہلے سے منتظر بیٹھی تھیں۔ دنوں بعد کچھ مطمئن سی، خوش سی نظر آ رہی تھیں۔

''خیریت پھپھو''۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھنے لگی۔

''مالک کی سالگرہ ہے۔ ابھی ابھی آدمی آیا تھا، شام چار بجے بلایا ہے ہم دونوں کو''۔ وہ اپنی پیالی میں چائے ڈالتی ہوئی خوش خوش بولیں۔

''پھپھو آپ چلی جائیں۔ میں گھر میں آرام سے بیٹھ کر ناول پڑھوں گی''۔ پرسوں کو شروع کیا ہوا ناول وہ اب تک آدھا بھی نہ پڑھ پائی تھی۔

''میں اکیلی نہیں جاؤں گی۔ بھلا مالک اور میں اکیلے بیٹھ کر اُس کی سالگرہ منائیں گے؟'' وہ تیوری چڑھا کر بولیں۔

مشعل بے اختیار ہنس دی۔

''اکیلے کیوں؟ اور کوئی نہیں ہوگا؟ اس کے دوست وغیرہ؟''

اور ___ دوست کے ذکر پر پھپھو کو جیسے اچانک خیال آیا۔

''ہاں، شیر شاہ بھی پہنچ گیا ہے کل شام''۔

اور ___ مقررہ وقت سے دو روز قبل ہی شیر شاہ کی آمد کی خبر سُن کر مشعل جیسے بات کرنا ہی بھول گئی۔ سر جھکا کر ناشتہ کرنے میں مصروف ہوگئی۔

مگر ___ پھپھو سے اُس کے چہرے پر حیا کی لالی اور آنکھوں میں خوشی کی دمک چھپی نہ رہ سکی۔

''پولٹری دینے جاؤ گی آج مالک کے یہاں؟ پھپھو نے بات بدل دی۔

''نہیں پھپھو۔ کل ہی اُس کے کُک نے ڈھیر ساری لے لی تھی کہتا تھا آج بے شک نہ دوں''۔

شیر شاہ کے چلے جانے کے بعد وہ کم ہی وہاں گئی تھی۔ خانساماں کا کہنا تھا آج کل کوئی خاص ضرورت نہیں پڑتی۔ پھر کل ہی وہ دنوں بعد گئی تھی تو اُس نے ڈھیر ساری اکٹھی لے لی تھی۔

کچھ یہ بھی تھا کہ کم از کم اس وقت وہ وہاں بالکل نہیں جا سکتی تھی۔ اتنے بہت سارے دنوں کے بعد وہ اچانک شیر شاہ کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں؟

اچھا ٹھیک ہے مگر شام چار بجے چلنا ضرور ہے۔ برا لگتا ہے اتنا بلایا ہے''۔

''اچھا پھپھو۔ ہاتھ نیپکن سے پونچھتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''جیسا آپ کہیں گی ویسا ہی ہوگا۔ اب چلوں؟''

''چلوں، کا مجھ سے کبھی مت پوچھو۔ خود ہی لگایا ہے خود کو یہ روگ۔ ارے میں کہتی ہوں اب بھی چھوڑ دو یہ ڈیوٹی۔ اتنا سا منہ نکل آیا ہے روزانہ کام کر کر کے''۔

''پھپھو آپ کو تو میرا منہ کبھی صحت مند نظر ہی نہیں آیا...''۔

''کاہے کو نظر آئے گا''۔ وہ چشمہ لگائے غور سے اس کے چہرے کو تک رہی تھیں۔ ''صبح ہوئی اور چل دیں ڈیوٹی پر۔ آخر پہلے بھی یہ کام ہو ہی جاتا تھا۔ موا عبداللہ تو اب مفت کی روٹیاں توڑتا ہے...''۔ وہ حسب عادت شروع ہوگئیں۔

اور ___ مشعل آہستہ سے وہاں سے کھسک گئی۔

اب تو وہ واقعی اِسے اپنی ڈیوٹی سمجھنے لگی تھی۔ ایسی ڈیوٹی جس سے کبھی بور نہیں ہوئی۔

روزانہ چھوٹے سے جزیرے کا چکر کاٹنا۔ جگہ جگہ پولٹری دینا۔ ہر ایک کا خندہ پیشانی سے حال احوال پوچھنا۔ اب تو جیسے ایک فرد بن گئی تھی وہ اس جزیرے کا۔ ہر جگہ کا پتہ تھا۔ تقریباً ہر مکین سے واقف تھی۔

ایک دن نہ جاتی تو جیسے بے چین ہو اٹھتے لوگ، کئی سوال کرتے، کئی بار پوچھتے۔ معمولی رہن سہن کے یہ لوگ کتنے مخلص تھے۔ اُن سے گھل مل کر رہنے میں وہ خوش تھی، مطمئن تھی۔

سفید زمین پر نیلے پھولوں والی قمیص شلوار اور نیلے شفون کا دوپٹہ لیتے ہوئے اس نے نیلے ہی رنگ کے شوز پہنے۔ برش کر کے اُس نے پن میں لگا نیلے رنگ کا خوبصورت پھول احتیاط سے بالوں میں اٹکایا۔ اپنی پسندیدہ کلون کپڑوں پر سپرے کرتی، وہ پھپھو کی طرف آ گئی۔

"ماشاء اللہ ماشاء اللہ، کہیں نظر نہ لگ جائے میری بچی کو"۔ لپک کر پاس آتے ہوئے پھپھو اُس کی بلائیں لینے لگیں۔

"مجھے تو آج آپ کی خیر نہیں لگ رہی"۔ مشعل الٹا انہیں چھیڑنے لگی۔

آج پہلی بار تو اُس نے پھپھو کو ریشمی ساڑھی باندھے دیکھا تھا۔ حلیہ بھی کچھ بہتر تھا۔ سُرمے کی مقدار کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی۔ تیل بھی تازہ تازہ ڈالا تھا بالوں میں۔

"اے رہنے بھی دو"۔ وہ کچھ شرما سی گئیں۔ "اب کیا رکھا ہے اِس جان میں۔ خُدا جنت نصیب کرے تمہارے پھوپھا کو ـــــ وہ زندہ تھے تو بات ہی کچھ اور تھی۔ اب تو بس سرمہ اور تیل لگائے رکھتی ہوں کہ بغیر سُرمے کے کچھ نظر نہیں آتا اور تیل نہ لگاؤں تو عقل کام نہیں کرتی ورنہ میرے دن نہیں اب ان کاموں کے"۔

وہ مسکرا دی۔

پھپھو واقعی سرمے اور تیل میں بڑا یقین رکھتی تھیں۔ اکثر زبردستی پکڑ کر اُس کی بھی آنکھوں میں سُرمہ لگا دیتی تھیں اور تیل تو ہفتے میں ایک بار باوجود احتجاج کے ڈھیر سارا تھوپ دیتی تھیں

اُس کے سر میں۔

"اچھا اب چلیئے چار بجنے والے ہیں"۔ اُس نے میز پر سے مالک کو تحفے میں دینے والا بڑا سا پھولوں کا گلدستہ اٹھا لیا۔

"ہاں چلو"۔ پھپھو ساڑھی کا پلو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے آگے بڑھیں۔

اور پھر ـــــ دونوں وین میں بیٹھ کر سیدھی مالک کے یہاں جا پہنچیں۔

گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہوئے اُس کا دل بے ترتیب سا ہو کر دھڑکا۔ شیر شاہ بھی ہوگا ـــــ کیسے سامنا کرے گی اتنے دن کے بعد؟ اور بھی کئی لوگ ہوں گے۔ سوچوں میں گم وین پارک کر کے وہ پھپھو کے ساتھ نیچے اُتر آئی۔

منتظر کھڑا ملازم انہیں اپنی ہمراہی میں لئے کوٹھی کے پچھواڑے بڑھا۔

نیچی سی ڈھلان کی نفیس گھاس، نایاب پھولوں کی کیاریوں اور خوبصورتی سے تراشیدہ نوخیز جھاڑیوں میں سے گزرتے وہ لوگ آگے بڑھ رہے تھے۔ پتھر کی چند سیڑھیاں اترنے کے بعد اب۔ ساحل سامنے تھا ـــــ جہاں سفید چمکیلی ریت تھی، پام کے اونچے درخت تھے، نیلگوں سمندر تھا۔

اُس نے ادھر ادھر نگاہ کی۔ کوئی ہنگامہ نہیں تھا۔ کوئی شور نہیں تھا۔ کوئی مہمان بھی نہیں تھا۔

ملازم آگے تھا۔ وہ لوگ پیچھے پیچھے۔

اُس نے مڑ کر دیکھا۔ پھپھو اپنی مخصوص چال بے ڈھنگی چلتیں کافی پیچھے رہ گئی تھیں۔

"مالک سامنے تشریف رکھتے ہیں"۔ ملازم کی آواز پر چونک کر وہ دوبارہ سامنے دیکھنے لگی۔

کچھ فاصلے پر، ساحل پر ـــــ بڑی سی چھتری کے نیچے، شفاف چمکتی ریت پر ـــــ تین کرسیاں رکھی تھیں، درمیان میں میز تھی۔ اور ـــــ سمندر کی طرف رُخ کئے مالک تشریف فرما

تھے۔

وہ اور آگے بڑھی۔

"مالک ــــ مہمان آگئے ہیں"۔ ملازم نے مؤدب طریق سے اطلاع دی۔

اور ــــ مڑ کر واپس چل دیا۔

"ہیلو"۔ رُخ اس کی طرف کرتے ہوئے مالک گویا ہوا۔

اور ــــ دونوں ہاتھوں میں تھامے پھول اُس کی گرفت سے چھوٹ کر نیچے ریت جا گرے۔

مالک؟ شیر شاہ؟

وہ بے یقینی کے عالم میں اُسے گھور رہی تھی۔

پرکشش ہونٹوں پر دلآویز تبسم لئے۔ دلنشیں آنکھوں میں جہاں بھر کی اپنائیت سمیٹے ــــ شیر شاہ یکاٹک سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ... آپ..."۔ اُس نیلگوں آنکھیں پوری پھیلی ہوئی تھیں۔

"ہاں"۔ اُس کی گھنی پلکوں کو جنبش ہوئی۔

اور ــــ جانے کیا ہوا؟ وہ یکدم مڑ کر واپس چل دی۔

اپنے اعتماد کی اپنے بھروسے کی کرچیاں ہوتے نہ برداشت کر پائی تھی شاید۔ اپنی محبت سے کسی دھوکے کی امید نہ تھی جیسے۔

تبھی ــــ شیر شاہ اس کے پیچھے لپکا۔

اُس نے جان بوجھ کر اُسے تکلیف دینا نہیں چاہا تھا۔ اگر ایسا کیا تھا تو کسی مصلحت کی بنا پر۔

اور پھر بعد میں تو کبھی من میں آتا بھی کہ اُسے بتا دے سب ــــ مگر ــــ

پھر چپ رہ جاتا، مشعل اکثر بہت پیارے انداز میں مالک کے خلاف بول لیا کرتی تھی، اُسے اچھا لگنے لگا تھا سب۔

"مشعل رُک جاؤ"۔ پاس جا کر اُس نے کہا۔

مگر ــــ وہ تیز تیز چلتی رہی ــــ مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

"مشعل ــــ پلیز"۔ وہ ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

مشعل کی رفتار اب بھی وہی تھی۔

"میری برتھ ڈے کو یوں spoil کر کے مت جاؤ"۔ اُس کے لہجے میں التجا تھی ــــ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُس نے روکنا چاہا۔

مگر ــــ ان سُنی کرتے ہوئے ــــ مشعل نے بے دردی سے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

سامنے سے آتی پھپھو ہکا بکا رہ گئیں۔ وہیں رک کر کبھی تیز تیز چلتی مشعل کو اور کبھی سامنے کھڑے شیر شاہ کو پریشان سی دیکھ رہی تھیں۔

"ارے کیا ہوا؟" مشعل قریب پہنچی تو انہوں نے پوچھا۔

مگر وہ خاموشی سے آگے نکل گئی۔

"ارے رُکو میں بھی چلتی ہوں"۔ وہ بدحواس سی اُس کے پیچھے لپکیں ــــ مگر ــــ

"آنٹی"۔ پیچھے سے شیر شاہ کی مدبری آواز اُبھری۔

"ہاں بیٹا"۔ وہ پھر پلٹیں۔

"آپ نہیں جائیں گی"۔ وہیں کھڑے کھڑے وہ مزید سنجیدگی سے بولا۔

"ہاں ــــ میں نہیں جاؤں گی"۔ وہ اُس کی طرف آنے لگیں۔

"ارے میں کیسے جاؤں گی تمہاری سالگرہ جو ہے..."۔

اور ـــ شیر شاہ مسکرا دیا۔ اُس کی مسکراہٹ تلخ سی تھی، گھائل سی تھی۔

مشعل بھی تو سوچ سکتی تھی ـــ آج اُس کی برتھ ڈے تھی۔ اور بہت اہم اس لئے بھی کہ آج اُس نے اپنے جنم دن پر مشعل کو بلایا تھا، اپنے پیار کو ـــ

اپنی زندگی کا یہ اہم دن امر کرنے کے لئے اُس نے آج کا دن اُس کے نام کر دیا تھا ـــ مگر ـــ کیسے اُس کی خوشیوں کا منہ چڑا کر چلی گئی تھی۔

''آیئے''۔ وہ دکھی سا پھپھو کے ساتھ کرسیوں کی طرف بڑھا۔

''کوئی اور نہیں آیا؟'' پھپھو کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

''نہیں ـــ میں نے نہیں بلایا''۔

آج اُس نے مشعل کو جو بلایا تھا، کسی اور کو توجہ دینے کا کیا وقت ملتا اُسے؟

پھپھو کی بات اور تھی ۔ اُن کی وہ بے حد عزت کرتا تھا، بہت قدر کرتا تھا۔ اُن کے خلوص اور بے ساختہ محبت میں اُسے اپنی ماں سے محرومیت کا مداوا سا ملتا تھا۔ ایک بار پہلے بھی اُس کی سالگرہ جزیرے پر آئی تھی ـــ اور تب بھی اُس نے پھپھو کو خاص طور سے مدعو کیا تھا۔

اُس کی گہری گھمبیرتا دیکھ کر پھپھو کی مزید پوچھ گچھ کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ بھلے ماں جیسی عزت دیتا تھا۔ مگر تھا تو مالک ہی۔

اور پھر اُس کی حالت ہی کچھ ایسی تھی۔ سُرخ چہرہ کسی زبردست اندرونی خلفشار کا غماز تھا۔ آنکھوں کا کرب کسی اندوہناک حادثے کی نشاندہی کر رہا تھا۔ اس کی ایسی کیفیت آج سے قبل انہوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

جانے کا کیا بات ہوئی تھی شیر شاہ کے اور مشعل کے درمیان؟

تبھی ـــ ملازموں نے وہیں آ کر ـــ وہی میز سجا دی۔

بہت عمدہ کیک کے علاوہ اور بھی کئی چیزیں تھیں۔ مزے مزے کی اشتہا انگیز۔

گزرتے لمحوں کے ساتھ جیسے وہ اپنے آپ پر قابو پانے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ چہرے پر اب وہ تناؤ ـــ نظروں میں وہ تکلیف نہ رہی تھی مگر ـــ

پُرکشش نقوش کو اداسیوں نے آن گھیرا تھا۔ دلنشیں آنکھوں میں دکھ بس گئے تھے۔

وطن میں بے پناہ مصروفیت ہونے کے باوجود وہ کل شام چلا آیا تھا۔ کہ اپنی سالگرہ مشعل کی سنگت میں منائے گا۔

اُس نے واپس چلے جانا تھا۔ ایک بہت ضروری کیس کے سلسلے میں اُس کی وہاں موجودگی اشد ضروری تھی۔ اور جس شخص کا وہ مقدمہ لڑ رہا تھا۔ وہ اس کے لئے بہت اہم تھا۔

مگر ـــ مصروفیت بے پناہ سہی، کیس بہت ضروری سہی ـــ مشعل تو اُس کی آتی جاتی سانس بن گئی تھی۔ وہ بہر حال مقدم تھی ـــ اور پھر آج ـــ تو اُس نے سوچا تھا وہ مزید انتظار نہیں کرے گا ـــ پروپوز کر ہی لے گا اُسے ـــ مگر ـــ

اُس نے گہری سانس لی۔ اُس کی سانسوں تک دکھ اُتر آیا تھا۔

پھر بھی ـــ اُس نے کیک کاٹا۔

مختلف چیزوں سے پھپھو کی تواضع کرتا رہا۔ خود۔ صرف کوفی کے ایک کپ پر اکتفا کیا ـــ کہ آج ـــ وہ واقعی اُداس تھا۔

پھپھو نے جو بڑے بڑے منصوبے بنائے تھے۔ اُس سے کُھل کر مشعل کے متعلق بات کرنے کے۔ دھرے رہ گئے سارے۔

اُس کی بے پناہ اُداسی دیکھ کر تو۔ اُن کے اپنے اوسان خطا ہوئے جا رہے تھے۔

یہ تو اچھا تھا شیر شاہ نے ہی گفتگو کا آغاز کیا۔ جزیرے سے متعلق پوچھ گچھ کی، مختلف ہدایات دیتا رہا۔ گو چہرے پر اُداسی کی چھاپ بہت گہری تھی، بھاری آواز میں یاسیت رچی بسی تھی۔

شام کو پھپھو گھر لوٹیں۔ مشعل کے کمرے میں گئیں ___ تو وہ اب بھی بستر پر اوندھی پڑی تھی۔

آہٹ پر چونک کر سر اٹھایا، پھپھو کی طرف دیکھا ___ آنکھیں سُرخ متورم تھیں، نظروں میں بے شمار شکوے تھے، انداز کئی شکائتیں لئے تھا۔ آہستہ سے سر دوبارہ تکیے پر رکھ دیا۔

پھپھو کا دل کٹ کر رہ گیا۔ کتنا روئی تھی وہ، کتنی خفا تھی۔

"مشعل بیٹے کیا بات ہے؟" اُس کے بستر کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔

اور ___ مشعل مزید برداشت نہ کر سکی۔

"پھپھو آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟" وہیں لیٹے لیٹے وہ بول ہی پڑی۔

"کیا؟"

"یہی کہ شیر شاہ ہی مالک ہے جزیرے کا۔"

پھپھو کا ماتھا ٹھنکا، ضرور اسی بات پر لڑ کر آئی تھی اُس سے۔

"ارے"۔ انہوں نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ "تو اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے"۔

"بات کو ٹالیئے نہیں، بتایئے مجھے کیوں نہیں بتایا؟" وہ مصر تھی۔

اور ___ اُسے مصر دیکھ کر پھپھو کو بتانا ہی پڑا۔

"مجھے شیر شاہ نے منع کیا تھا"۔

"کیا مطلب؟" وہ سیدھی ہو بیٹھی۔ خفگی کے ساتھ ساتھ اُسے حیرت بھی ہوئی۔

"دراصل جس وقت بیرسٹر صاحب کا تار پہنچا کہ تم اس جزیرے پر پہنچنے والی ہو، شیر شاہ یہاں میرے پاس موجود تھا۔ وہ پورے چھ مہینے کے بعد جزیرے پر آیا تھا اس لئے حسبِ معمول مجھے ملنے آیا ہوا تھا۔ تار میں نے اُسی سے پڑھوایا۔ پھر میں نے ہی اُسے بتایا کہ تم کون ہو

اور کن حالات میں یہاں پہنچ رہی ہو۔ تمہارے اچھے دنوں کے متعلق اور پھر بعد کی کسمپرسی کے بارے میں جان کر اُسے بہت دُکھ ہوا۔ اتنا کہ کافی دیر بول ہی نہ سکا۔ گم سم رہا"۔

پھر بولا ___ وہ خود تمہیں لینے ایئر پورٹ جائے گا۔ تا کہ تمہیں عام کشتیوں میں راستے میں تکلیف نہ ہو۔ ساتھ ہی مجھے منع کیا کہ میں اُس کے جزیرے کے مالک ہونے کا تمہیں ہرگز نہ بتاؤں۔ اُس کی ملکیت اس جزیرے میں تم آزادی سے گھوم پھر سکو۔ تمہیں یہ احساس نہ ہونے پائے کہ اس جزیرے پر اُس کا مالک اُنہی آسائشوں سے پُر قیام گاہ میں رہتا ہے جن میں کبھی تم ہوا کرتی تھیں۔ تمہاری خودداری مجروح نہ ہو، تمہیں دُکھ نہ ہو، تم اپنے آپ کو کمتر محسوس نہ کرو....

مشعل کو یاد آیا پہلی پہلی بار جب وہ پولٹری تقسیم کرنے نکلی تھی، کسی طرح راستہ پا کر مرغیاں وین سے اُترنا شروع ہو گئی تھیں، اُسے غصہ آ گیا تھا، اور وہ ایک کے بعد ایک مرغیوں کو باہر پھینکنا شروع ہو گئی تھی کہ اوپر سے شیر شاہ آ گیا تھا ___ اور تب ___ اس کی آن بان دیکھ کر اُسے واقعی اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا تھا۔

مگر ___ بعد میں اُس کا دوستانہ اور مخلصانہ رویّہ دیکھ کر یہ احساس جاتا رہا تھا۔

"بقول اس کے جگہ چھوٹی تھی، تمہاری اور اُس کی مڈبھیڑ یقینی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ اگر تمہیں اُس کے بارے میں نہ بتایا جائے تو یوں تم نہ مالک کو جان پاؤ گی اور نہ ہی تمہیں اپنی محرومیوں کا احساس ہوگا...." پھپھو بتاتی گئیں۔

اور ___ مشعل حیرت سے پھیلی آنکھوں سے انہیں دیکھتی گئی۔ شیر شاہ نے اُس کے لئے کتنا سوچا، کیا محسوس کیا تھا؟ اور وہ اُس کے متعلق کیا سوچ رہی تھی اور محسوس کر رہی تھی؟ شیر شاہ کے بالکل الٹ، سراسر برعکس۔

"پھر نہ جانے کیا ہوا اُسے"۔ پھپھو پھر کہنے لگیں۔ "مجھے تو منع کر گیا تھا۔ خود ہی تمہیں کوٹھی

پر ملنے لگا۔ بلکہ مجھے تو کبھی کبھی لگتا تھا تم جان گئی ہو اُسے یا پھر خود اس نے ہی تمہیں اپنی شناخت کروادی ہے ___ بلکہ ___ آج صبح جب اُس کا کارڈ ملا اس میں شیر شاہ ہی لکھا تھا ۔ میں تو تمہیں بتاتے بتاتے رہ گئی تھی۔ سوچا اُس کے ملازم نے خاص طور سے مجھے بُلا کے بڑے اعتماد سے کارڈ تھمایا تھا۔ اس کا مطلب تھا تم ابھی کچھ بھی نہیں جانتیں اُس کے متعلق ___ اس لئے میں پھر خاموش رہی...''۔

''اچھا پھپھو بس''۔ اُس کی ساری کدورت جاتی رہی تھی۔ معصومیت سے ہنس دی۔ ''مجھے معاف کردیں۔ خواہ مخواہ آپ کو پریشان کیا''۔ اُس نے پھپھو کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''اے ہٹو''۔ اُسے ہنستے ہوئے دیکھ کر پھپھو بھی بھڑک اٹھیں۔ ''مجھے کیا پریشان کیا ___ پریشان تو اُس بھلے آدمی کو کیا۔ جو بس رویا نہیں میرے سامنے۔ اداس اتنا تھا کہ کہنے کی بات نہیں...''۔

مشعل دم بخود رہ گئی۔ گہری اداسیوں نے گھیر لیا۔ بولی کچھ نہیں ___ کہ کیا دھرا سب اسی کا تھا۔

''لو اب تم اداس ہوگئیں ___ اٹھو منہ دھوؤ ___ میں تمہارے لئے مچھلی تلتی ہوں جا کر۔

اور مشعل اٹھ کر غسل خانے میں گئی۔ تو پھپھو نے باورچی خانے کا رُخ کیا۔ کہ خود اُن کو تو اتنی خاص بھوک نہیں تھی۔ مارے بدحواسی کے سالگرہ پر ہی ڈھیر سارا کھا کر آئی تھیں مگر مشعل کے لئے تو کچھ نہ کچھ رنا تھا۔ اُس نے تو دوپہر کو بھی ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا تھا۔

مشعل رات کو دیر تک کروٹیں بدلتی رہی۔

''کہاں دینے جا رہی ہو؟ کون سی جگہ باقی ہے؟ پہلی پہلی بار وہ پولٹری دینے نکلی تھی تو راستے میں اُس سے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔

''مالک باقی رہتا ہے''۔ اُس نے کہا تھا۔

''اوہ ___ چھوڑو اس کو''۔

''کیسے چھوڑ دوں مرغیاں انڈے نہیں ملیں گے تو وہ بھوکا رہ جائے گا بچارا''۔

اور ___ اُس کی بات پر ___ وہ بے اختیار ہنس دیا تھا۔

''اے۔ لائسنس بھی ہے تمہارے پاس؟'' وہیں اُسی ملاقات میں اُس نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

''کیوں؟''

''مالک کے یہاں جاؤ گی تو وہ لائسنس کے بغیر گھسنے دے گا؟''

''اوہ''۔ وہ کچھ بدحواس سی ہوگئی تھی''۔ وہ لائسنس بھی چیک کرتا ہے؟''

''جزیرے کا مالک ہے حق تو بنتا ہے۔ خاص طور سے جب وہ یہ دیکھے گا کہ تمہاری عمر ابھی لائسنس کے قابل نہیں''۔

''وہ ___ مالک سو رہا ہے اب تک؟ پہلی بار وہ اس کی کوٹھی پر گئی تھی تو اُس سے پوچھا تھا۔

''بڑی جلدی خیال آیا''۔ شیر شاہ نے کہا تھا۔

''کیا بوگس آدمی ہے''۔ وہ نخوت سے بولی تھی۔ ''اتنے خوبصورت جزیرے کا مالک ہے۔ کبھی باہر نکل کر دیکھتا ہی نہیں شاید...''۔

''دراصل ___ اس کی ایک ٹانگ میں نقص ہے۔ نہیں چاہتا ہوگا کہ ___ اتنی خوبصورت لڑکی اسے لنگڑاتے دیکھے''۔

''چوری بھی کرتی ہو''۔ باغ میں کیلوں کا گچھا پکڑتے اُس کے ہاتھ کو کسی نے پکڑا تھا۔

''اوہ ___ آپ ہیں''۔ شیر شاہ کو دیکھ کر اُس کی جیسے جان میں جان آگئی تھی۔ ''میں سمجھی...''۔

"مالک آ گیا ہے"۔ شیر شاہ نے کہا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے اس باغ میں جزیرے کے مالک کی اجازت کے بغیر کوئی نہیں آ سکتا"۔

"میں تو آ گئی ہوں"۔ اُس نے اطمینان سے کہا تھا۔

"آپ کو مالک نے یاد کیا ہے"۔ شیر شاہ کے وطن جانے سے قبل وہ کوٹھی پر پولٹری دینے گئی تھی تو اس کا ملازم بولا تھا۔

"مجھے؟" اُس نے حیرت سے پوچھا تھا۔

اور ___ دروازہ کھول کر وہ کمرے کے اندر داخل ہوئی تھی۔

ان گنت قرمزی پھولوں سے لدی خوبصورت بالکنی کی اوٹ میں لگا چوڑا اور نفیس بیڈ تھا۔

اور ___ شاید مالک اُس پر بازوؤں کے حلقے میں سر لئے اوندھا لیٹا تھا ___

اُس نے رُخ اس کی طرف کر لیا۔

یہ تو ___ شیر شاہ تھا۔

اس کی ساری جھجک ختم ہو گئی تھی۔

"کہو۔ کیسے آنا ہوا؟" اُس نے پوچھا۔

"اوہ"۔ اُسے جیسے اچانک خیال آیا تھا۔ "مجھے تو ___ مالک نے بلایا تھا۔

"مالک نے؟ اس کا۔ پاس والا کمرہ ہے۔ مگر۔ وہ تو دوسرے جزیرے پر کام سے چلا گیا ہے..."۔

"پتہ نہیں کیا کہنا تھا اُس نے؟" وہ پریشان سی بولی۔

"یہی کہ ___ بچارا بھوکا رہ گیا ہے۔ یقیناً آنٹی کو یہی کہلوانا چاہتا ہوگا..."۔

پچھلی کئی باتیں، کئی واقعات اس کی نظروں کے سامنے آ جا رہے تھے۔

مگر ___ جہاں شیر شاہ کی برتھ ڈے چھوڑ چھاڑ وہ وین میں بیٹھی گھر کی طرف آ رہی تھی یہی سب باتیں، یہی سارے واقعات اُس کے جیسے تن بدن میں آگ لگا رہے تھے۔ وہاں ___ اس وقت ___ وہی باتیں، وہی واقعات اُسے لطف دے رہے تھے، محظوظ ہو رہی تھی وہ اُن سے۔

کروٹیں بدل بدل ___ آنکھیں موند موند کر۔ وہ وہی باتیں سوچے جا رہی تھی۔ وہی واقعات دہرائے جا رہی تھی۔ اُسے مزا آ رہا تھا۔ اچھا لگ رہا تھا سب۔

پر ___ ساتھ ہی ___ یہ سوچ کر ___ کہ کل وہ اُس کی سالگرہ اٹینڈ کئے بغیر ہی چلی آئی تھی۔ اُس کے بار بار روکنے کی بھی پرواہ نہیں کی تھی۔

"... مجھے کیا پریشان کیا ___ پریشان تو اُس بھلے آدمی کو کیا ___ جو بس رویا نہیں میرے سامنے ___ اُداس اتنا تھا کہ کہنے کی بات نہیں..."۔ بار بار پھپھو کے الفاظ اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

بار بار وہ بھی پریشان ہوئی ___ مگر ___

"بس رویا نہیں میرے سامنے..."۔ ہر بار اُسے ہنسی بھی آئی۔

پہاڑ جیسی سنگین چیز ___ اور رونا! وہ پھر ہنس دی۔

پھپھو بھی کیا چیز تھیں۔ سیدھی سادی بات کے محاورے بناتی رہتی تھیں۔

"اداس تھا اتنا کہ..."۔ معافی مانگ لے گی کل جا کر۔ منا لے گی اُسے۔ اُس نے سوچنا ہی بند کر دیا۔

کروٹ دیوار کی طرف لے کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

صبح صبح پولٹری لے کر وہ سیدھی شیر شاہ کی کوٹھی پر پہنچی۔ کچن کے آگے وین روک کر وہ نیچے اتر آئی۔ خانساماں جلدی جلدی انڈے نکالنے لگا۔

''تمہارے مالک جاگ رہے ہیں''۔ مشعل نے پوچھا۔

''میم صاحب وہ تو چلے گئے ہیں''۔ وہ ہاتھ روک کر مؤدب طریق سے بولا۔

''کہاں؟''___

''وطن''۔ اُس کے خوبصورت چہرے پر زردی کھنڈ آئی۔

''مگر ___ اتنی جلدی...''۔ اس کے لہجے میں مایوسی انتہا پر تھی۔

''رکنا تو تھا ایک دو روز پر ___ اچانک صبح چلے گئے...''۔

وین میں بیٹھ کر چلی ___ تو اُسے احساس ہوا۔ اس کا بھی ___ رواں رواں اداس ہو چلا تھا۔ شیر شاہ یقیناً اُسی کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر وقت سے پہلے چلا گیا تھا۔ خفا ہو گیا تھا اُس سے۔

اور ___ تبھی اُسے احساس ہوا۔ رات جو وہ شیر شاہ کی اداسی کو معمولی سی بات سمجھ کر اور اُس سے معافی مانگ کر، منا کر بات ختم کرنے کا سوچ رہی تھی۔ بات اتنی چھوٹی نہیں تھی، معاملہ سنگین تھا۔

ٹوٹی پھوٹی، بکھری بکھری سی وہ مختلف جگہوں پر پولٹری دے کر گھر لوٹی۔ تو جیسے جسم کا ایک

ایک عضو نڈھال تھا۔ خود کو گھسیٹتی وہ اپنے کمرے میں بستر تک آئی۔ اور وہیں اوندھی پڑ رہی۔

پھپھو پڑوس میں گئی تھیں ___ واپس آئیں، باورچی خانے میں گئیں، دیکھا کھانا جوں کا توں پڑا تھا ___ وین تو آئی کھڑی تھی، پھر مشعل نے کھانا کیوں نہیں کھایا تھا؟

اس سے پہلے بھی اگر پھپھو کبھی کام سے نکلی ہوتی تھیں اور ایسے میں مشعل گھر لوٹ آتی تھی تو باورچی خانے میں رکھا کھانا کھا کر اپنے کمرے میں سو رہتی تھی۔ پر آج؟ لگتا تھا وہ اس طرف آئی ہی نہیں۔

کچھ سوچتی ہوئیں، کچھ بڑبڑاتی ہوئیں وہ مشعل کے کمرے کی طرف بڑھیں۔

اندر داخل ہوئیں۔ دیکھا مشعل اوندھی پڑی سو رہی تھی۔

اُن کا دل دھڑکا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی، پاس جا کر ماتھا چھوا۔

''ارے بخار میں تپ رہی ہے یہ تو''۔ وہ جلدی جلدی کبھی اس کا نبض اور کبھی ماتھا محسوس کرنے لگیں۔ ''ارے عبداللہ۔ کہاں ہو تم۔ کمبخت کبھی جو وقت پر نظر آیا ہو...''۔ وہ بوکھلائی سی لپکیں اپنے کمرے میں سے دوا لانے۔

مشعل نے تھکی تھکی سی کروٹ لی۔ ارد گرد دیکھا۔ کیسی بے ترتیبی سے پڑ رہی تھی۔ اُٹھ کر اُس نے بستر سے چادر ہٹائی اور جوتے اتار کر دوبارہ لیٹ رہی۔

''یہ لو بیٹا''۔ پھپھو دو گولیاں اور گلاس میں گرم دودھ لئے دوبارہ آ گئیں۔ ''جلدی سے کھا لو۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھولنے لگے ہیں...''۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے پھپھو۔ بس سر میں درد ہے ذرا سا''۔

''لو۔ سر میں درد ہے وہ بھی ذرا سا۔ ارے بخار ہے بہت سارا۔ یہ گولیاں لو۔ فرق پڑا تو ٹھیک ہے ورنہ کہلاتی ہوں شیر شاہ کو ڈاکٹر کا بندوبست کرے...''۔

وہ واقعی بوکھلائی جا رہی تھیں۔ مشعل کی تو ذرا سی تکلیف سے وہ گھبرا اُٹھتی تھیں۔ اور پھر

بقول اُن کے خود وہ انؑ کے بھائی صاحب کی امانت بھی تو تھی۔ پھر کچھ عرصہ سے تو وہ مشعل کو بے حد عزیز سہی پر بہت ہی بڑی ذمہ داری، بہت ہی دھان پان سہی پر بے حد ہی بھاری بوجھ سمجھ رہی تھیں۔ کبھی رحمت بابا کے خطوط کے ذریعے مسٹر خان کی مشعل سے شادی کے تقاضے انہیں بوکھلا رہے تھے تو کبھی شیر شاہ سے اُس کی بڑھتی ہوئی ملاقاتیں تشویش بڑھا رہی تھیں۔ عجیب مصیبت میں تھی جان اُن کی۔ اوپر سے اس کا اتنا تیز بخار۔ اب پتہ چلا تھا انہیں کہ جوان لڑکی کی ذمہ داری کیا ہوتی ہے؟

''وہ ___ وہ جا چکا ہے''۔ مشعل گولیاں لے کر گلاس اُن کے ہاتھ سے تھامتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

''ارے کہاں؟'' مارے گھبراہٹ کے وہ وہیں دھم سے اس کے بستر پر بیٹھ رہیں۔

''وطن''۔

''ارے وہ تو جانا تھا اُس نے۔ تم نے تھوڑا دکھی کیا ہے کل اُس کو۔ ارے اب کیا ہوگا۔ ڈاکٹر کو کون لائے گا''۔ وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر بین کرنے لگیں۔

اُن کی حالت دیکھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی مشعل ہولے سے مسکرا دی۔

''پھپھو آپ حوصلہ کریں۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ ڈاکٹر کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔ گولیاں نگل کر اس نے خالی گلاس میز پر رکھا۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو''۔ وہ جلدی جلدی اُس کا سر دباتے ہوئے درود شریف کا ورد کرنے لگیں۔

کتنا خیال کرتی تھیں پھپھو اُس کا۔ کتنا چاہتی تھیں اُسے۔

''پھپھو آپ نے کھانا کھایا ہے؟'' مشعل کو یقین تھا انہوں نے کھانا نہیں کھایا تھا۔

''شُف، شُف، شُف''۔ انہوں نے اُس کے سارے جسم پر دم کیا۔ ''بیٹا تم ٹھیک ہو جاؤ

پھر کھاؤں گی''۔ وہ اب بھی بوکھلائی بوکھلائی تھیں۔

''آپ یہیں لے آیئے دونوں کھاتے ہیں''۔

مشعل نے خاصتاً پھپھو کی خاطر کہا ورنہ اس کا تو نوالہ بھی لینے کو جی نہیں کر رہا تھا۔

''ہاں ایسا ہی کرتی ہوں''۔ وہ اٹھ کر چل دیں۔

اور پھر ___ تھوڑی ہی دیر میں ___ ٹرے میں گرم گرم کھانا لے آئیں۔ آلو قیمہ تھا، ماش کی دال اور چپاتیاں تھیں۔

وہیں مشعل کے آگے میز پر رکھ کر وہ بھی بستر پر بیٹھ رہیں۔

خود بھی کھاتی رہیں اُسے بھی اصرار کر کر کے کھلاتیں رہیں۔

کل سے ہی مشعل کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی انہیں۔ بہت اداس اور سخت ذہنی دباؤ کے اثر میں تھی جیسے۔ اوپر سے شیر شاہ کا چلے جانا، پھر تھکاوٹ ___ بخار تو ہونا تھا۔

''تمہیں ملا تھا شیر شاہ؟''

''نہیں۔ میرے جانے سے پہلے جا چکا تھا''۔

''مگر ___ وہ اتنی جلدی گیا کیوں؟''

''پتہ نہیں۔ ملازم کہتا تھا ایک دو روز رُکنا تھا پر اچانک آج ہی چلا گیا''۔

''وہ سچ مچ تم سے خفا ہو کر گیا ہے ___ میں سے کہا تھا نا بس رویا نہیں میرے سامنے...''۔

جانے کہاں سے؟ ایک بار پھر مشعل کے لبوں پر مدھم سا تبسم ابھر آیا۔

''پھر اب کیا ہو سکتا ہے پھپھو''۔

''ہاں ___ اب کیا ہو سکتا ہے''۔

کھانے کے بعد بھی پھپھو وہیں بیٹھیں اس کا دھیان باتوں میں لگائے رہیں۔

شام تک اس کا بخار اُتر گیا۔ پھپھو کی جانِ ناتواں میں بھی جان آگئی۔

ایک بار پھر اداسیوں میں ڈوب گئی تھی۔ چپ چپ رہنے لگی تھی۔

مہینہ بھر پہلے ہی انتظار کی نذر ہو چکا تھا۔ پل پل، لمحہ لمحہ گن کر گزارا تھا اُس نے ــــ مگر ــــ

وہ آیا بھی تو کیسے؟ چند گھنٹوں کے لئے اور بس ــــ نہ مل کر گیا نہ کچھ کہہ سن کر ــــ مانا کہ اس میں قصور مشعل کا بھی تھا۔ جب شیر شاہ نے روکنا چاہا تو اُسے رُک جانا چاہئیے تھا۔ اُس کی سالگرہ تھی اور اس کے لئے بہت اہم دن بھی۔ مگر ــــ اُس کے بھی تو اعتماد کو ٹھیس پہنچی تھی، بھروسے کی کرچیاں ہوئی تھیں۔

"...مجھے منع کیا کہ میں اُس کے جزیرے کے مالک ہونے کا تمہیں ہرگز نہ بتاؤں.... تمہیں یہ احساس نہ ہونے پائے کہ اس جزیرے پر اُس کا مالک انہی آسائشوں سے پُر قیام گاہ میں رہتا ہے جن میں کبھی تم ہوا کرتی تھیں۔ تمہاری خودداری مجروح نہ ہو، تمہیں دُکھ نہ ہو، تم اپنے آپ کو کمتر محسوس نہ کرو... اُس کا خیال تھا کہ... یوں تم نہ مالک کو جان پاؤ گی اور نا ہی تمہیں محرومیوں کا احساس ہوگا"۔

پھپھو کے الفاظ اُس کے کانوں میں گونجے۔ اور ایک بار پھر وہ نادم محسوس کرنے لگی۔

شیر شاہ نے اُسی کی خاطر بھرا تھا یہ بہروپ۔ کتنا خیال تھا اُسے اس کا۔ شروع دن سے۔ کتنا اونچا کردار تھا اُس کا۔

"مشعل رک جاؤ... پلیز... میری برتھ ڈے کو یوں SPOIL کر کے مت جاؤ..."۔

اُس کی التجا آمیز آواز اب بھی اُس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔

کس بے دردی سے اُس نے اس کا ہاتھ جھٹکا تھا۔ سوچتے ہی وہ پاگل ہونے لگی۔

پھپھو کہتی تھیں وہ اُس سے خفا ہو کر گیا ہے۔ اور ایسا کرنے میں وہ حق بجانب بھی تھا۔

اُس نے تھکی اداس سانس لی۔ اور مرغیوں کو دانہ دینے مرغی خانے کی جانب چل دی۔

وہ اُسے منائے گی۔ دانہ دیتے دیتے وہ پھر سوچنے لگی۔

مگر کب؟ کہاں؟ وہ پھر آئے گا بھی؟ کب آئے گا؟ اب کے تو اُسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا اُس کے پروگرام کے متعلق۔

وہ اور بھی پریشان ہو گئی۔ اُسے گئے بھی پندرہ سولہ دن ہو چکے تھے۔ کوئی خیر خبر معلوم نہ ہو سکی تھی اب تک۔ وہ پولٹری دینے کبھی کبھار جاتی بھی تھی وہاں مگر ـــــ اُس کے ملازموں سے کچھ پوچھنا مناسب نہ لگتا اُسے۔

دانہ ڈال کر وہ اُٹھ آئی ۔ پانی لینے گئی مرغیوں کے لئے۔

وہ منائے گی اُسے تو وہ مان جائے گا؟ پانی لاتے لاتے اُس نے سوچا۔

کہیں بہت خفا تو نہیں ہو گا؟ لگتا تو ایسا ہی تھا۔ جبھی تو بغیر ملے بغیر کچھ بتائے چلا گیا تھا۔ ورنہ اس سے قبل ـــــ

اُس نے بڑی ہوشیاری سے اُس سے ملنے کی راہ نکالی تھی، اپنا پروگرام بتایا تھا۔

"اے ـــــ تم نے مالک کے یہاں پولٹری نہیں دی؟ وطن جانے سے ایک روز قبل اُس نے مشعل کو ہوٹیل پر انڈے مرغیاں دیتے آلیا تھا۔

"کیوں نہیں دی، ابھی ابھی تو دے کر آ رہی ہوں"۔ وہ حیرت سے بولی تھی۔

"وہ تو کہتا ہے نہیں دی۔ جا کر پتہ کرو ملازم سے۔ مالک کو ضروری چاہئیں مہمان آ رہے

ہیں اُس کے"۔

اور ـــــ مجبوراً اُسے واپس جانا پڑا تھا۔

تھوڑے ہی فاصلے پر دیکھا وہ راستہ روکے کھڑا تھا۔

وہ بھی وین سے اتر آئی۔ اُس کے قریب چلی گئی۔

"مت جاؤ وہاں"۔ اُس نے اُس کے لئے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔

"کیوں؟" وہ بیٹھ گئی۔

"میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا"۔ وہ ہنس دیا۔ "اب ہوٹیل والوں کے سامنے کیا کہتا"۔

"لیکن ـــــ بات کیا ہے"۔

"تم سے ملنا ہے اور کیا"۔

"تو ابھی تھوڑی دیر پہلے جو میں کوٹھی پر آئی تھی..."

"میں سوئمنگ کر رہا تھا، پاس والے جزیرے تک گیا تھا"۔

"اوہ ـــــ پھر"۔

"پھر یہ کہ کل میں جا رہا ہوں..."۔

وہ سوچوں سے اُبھری۔ پھر اس کی ناراضگی یاد آئی۔

کہیں غصہ تو نہیں ہو گا؟ مرغیوں کو پانی ڈالتے ڈالتے اُسے اچانک خیال آیا۔

اور ـــــ اُس کے یاقوتی لب خود بخود مسکرا دیئے۔

نہیں ـــــ وہ تو اُس سے اِس قدر شفقت سے پیش آتا تھا۔ اس قدر معصوم سمجھتا تھا اُسے۔ اگر کبھی کوئی موقعہ آیا بھی جھڑکنے کا تو فراخدلی سے معاف کر دیا۔ درگزر کر دیا۔

غصہ! غصہ تو وہ کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ جانتا ہی نہیں تھا شاید غصہ ہونا۔

مسکراتے مسکراتے ہی ـــــ وہ کچن کی طرف آنے لگی۔

"اے کہاں ہو مشعل بیٹا ۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول رہے ہیں"۔ پھپھو ہاتھ میں کھلا خط لئے سبزی کے باغیچے کے قریب مشعل سے ٹکراتی اپنی رو میں آگے بڑھتی گئیں۔

"یہ ہوں پھپھو کیا بات ہے؟" مشعل نے واپس پلٹ کر انہیں کندھے سے تھام لیا۔

"ارے یہ خط دیکھو۔ میرے تو حواس کام نہیں کر رہے..."۔ واویلا بدستور جاری تھا۔ لکھا ہے خان صاحب خود جزیرے آکر تمہیں اٹھالے جائے گا... ہائے... کیا ہوگا۔ میں نے تو اُس رات بھی قریبی چھپر میں اندھیرے میں دو آدمیوں کو بندوقیں لئے کھڑے دیکھا تھا۔ حالت بھی مشکوک تھی دونوں کی... ہائے... تمہیں اس لئے نہیں بتایا کہ گھبرا جاؤ گی۔ خود ساری رات تھر تھر کانپتے گزری۔ ہائے ___ صبح دیکھا تو غائب تھے دونوں ___ کیا ہوگا..."۔

مشعل کا بھی رنگ بدل سا گیا۔ خط ان کے ہاتھ سے لے کر نظریں دوڑانے لگی۔

بعد سلام دعا کے رحمت بابا نے لکھا تھا۔

"... پچھلے دنوں میں بیرسٹر صاحب کے یہاں گیا تھا۔ اُنہی سے معلوم ہوا آپ کا خط اُن کے پاس آیا تھا۔ آپ کے کہنے کے مطابق انہوں نے کوٹھی کے کاغذات خان صاحب کو لوٹا دیئے ہیں۔ مگر فرماتے تھے کہ خان صاحب یوں ٹلنے والے نہیں ہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ وہ خود آپ کے جزیرے پر آکر مشعل بی بی کو اٹھا نہ لے جائیں..."۔

مشعل کا دل دھک سے رہ گیا۔

بات یہاں تک بھی پہنچ سکتی تھی یہ تو اس کے خواب میں بھی نہیں تھا۔

ساری تیزی، دلیری جاتی رہی۔

اس چھوٹے سے غیر محفوظ مکان میں ___ جس کے اردگرد دیوار تک نہ تھی، وہ اور بلند بانگ باتیں کرنے والی ڈرپوک سی پھپھو تھیں۔ دو اکیلی، کمزور عورتیں۔ بلا کیا مقابلہ کرسکتی تھی ایک بدطینت مرد کا۔

لے دے کے عبداللہ تھا۔ اُس کی بھی کیا عمر تھی۔ زیادہ سے زیادہ بیس سال۔ منحنی کمزور سا۔ خان آئے گا تو اکیلا تھوڑی آئے گا۔ ایسے کاموں کے لئے تو کئی کئی آدمیوں کی مدد ساتھ لائی جاتی ہے۔

گھبرا کر ___ وہ رودی۔

"ارے ___ رونے لگیں"۔ پھپھو نے جلدی سے گلے سے لپٹا لیا۔ "تمہاری یہ پھپھو زندہ ہیں ابھی ___ مجال ہے کسی کی یہاں قدم بھی رکھے"۔ اوسان تو اُن کے خطا تھے مگر مشعل کی خاطر خود کو سنبھالنا پڑا۔ "خبردار جو ایک بھی آنسو بہایا۔ دیکھتی ہوں کس طرح آتا ہے یہاں۔ ہاجرہ سراج کو نہیں جانتا یہ..."۔

اور ___ مشعل نے ان کے لہجے کی کپکپی صاف محسوس کرلی۔

"پھپھو ہم کیا کریں گے"۔ وہ مزید رودی۔

"خدا جو ہے بیٹا۔ آؤ اندر چلو"۔ وہ گھبرائی گھبرائی پریشان سی اُسے اندر کمرے میں لے آئیں۔

کرسی پر بٹھایا، پانی پلایا۔ تسلی دی، چپ کرایا۔

مگر خود ___ دل ہی دل میں ہول کھا رہی تھیں۔ کیا کریں گی وہ؟

ایک اکیلی جان تھیں۔ مشعل تو بچی تھی۔ عبداللہ بھلا کس کام کا تھا ایسے موقع پر؟ سوچ سوچ کر ہارنے لگی تھیں کہ ___

یکدم ہی جیسے ذہن میں کوندا سا لپکا۔

"ہم دونوں مالک کے یہاں چلے جائیں گے"۔ وہ اچانک بولیں۔

اُن کی آواز میں خوشی کی جھلک تھی۔ آنکھوں میں اطمینان کی چمک۔

مشعل سیدھی ہو بیٹھی۔ پُر اُمید نظروں سے پھپھو کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس کی معصوم

آنکھوں میں امید کی چمک تھی، آس کی روشنی تھی۔

"ہاں یہی ٹھیک ہے۔ بلکہ مالک خود موجود ہوتا یہاں تو وہ بھی یہی کہتا"۔ اب کے پھپھو کی آواز میں اطمینان کے ساتھ ساتھ دبدبہ بھی تھا۔ "وہ کوئی غیر تھوڑی ہے۔ اپنے بزرگوں کی طرح سمجھتا ہے مجھے۔ خدا عمر دراز کرے وہ تو دکھیوں کا ساتھی ہے۔ بے کسوں کا وسیلہ بنا کر بھیجا ہے اس جزیرے پر پروردگار نے اُسے..."۔ اُس کے بستر کی پٹی پر بیٹھی پھپھو شیر شاہ کے گُن گا رہی تھیں۔

اور مشعل دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔ ایسے آڑے وقت میں اچھا تھا شیر شاہ کا گھر تھا یہاں۔

لیکن اگر ___ وہ خان وہاں بھی آ گیا تو؟ اُسے پھر سے فکر لاحق ہو گئی۔

"اُٹھو بیٹا کھانا کھاتے ہیں۔ اور پھر ضروری چیزیں سمیٹ کر فوراً ہی چلتے ہیں مالک کے یہاں"۔ پھپھو اُٹھنے لگیں۔

"لیکن پھپھو ___ خان وہاں بھی تو آ سکتا ہے"۔ اُس نے اپنا اندیشہ ظاہر کر ہی دیا۔

"مجال ہے اُس کی، ٹانگیں تڑوانی ہیں اپنی۔ پہرے دار بندوقوں کے ساتھ رہتے ہیں وہاں ہر وقت۔ اور پھر میں تار بھی تو دلوانے لگی ہوں مالک کو فوراً پہنچنے کو کہتی ہوں"۔

ہاں یہ ٹھیک تھا۔ مشعل مطمئن سی نظر آنے لگی۔

وہ خود موجود ہو گا تو مشعل کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا تھا۔ جانے کیوں اُسے یقین تھا پکا۔

اور ___ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد۔ ضروری سامان سمیٹتے ہی عبداللہ کو گھر کا خیال رکھنے کو کہہ ___ وہ دونوں سیدھی مالک کے یہاں جا پہنچیں۔

شیر شاہ کے ملازموں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُس کے ملازم خاص نے اپنی نگرانی میں

ان کا سامان کوٹھی کے پچھواڑے بنے مہمان خانے میں لگوایا۔ دونوں کے کمرے پاس پاس تھے۔ ہر کمرہ جدید اور آرام دہ سامان سے آراستہ تھا۔

ذہنی طور پر تھکی تھکائی مشعل نے باتھ روم میں جا کر ٹھنڈے پانی کا شاور لیا۔ باہر نکلی۔ کمرے میں صوفے کے آگے لگی میز پر پڑے ٹرے میں سجی کوفی اور سینڈوچز دیکھے تو بے اختیار اُسے وطن میں اپنا گھر یاد آ گیا۔

دکھی سی سانس لے کر وہ صوفے پر آئی۔ اردگرد نظریں دوڑائیں۔

"... تمہیں یہ احساس نہ ہونے پائے کہ اس جزیرے پر اُس کا مالک انہی آسائشوں سے پُر قیام گاہ میں رہتا ہے جن میں کبھی تم ہوا کرتی تھیں..."۔ اُسے پھپھو کی بتائی ہوئی شیر شاہ کی کہی بات یاد آ گئی۔

"اُس کا خیال تھا کہ ... یوں تم نہ مالک کو جان پاؤ گی اور نا ہی تمہیں اپنی محرومیوں کا احساس ہو گا"۔

کتنا سچ کہا تھا اُس نے۔ اس سے قبل بھی وہ اس کی رہن سہن دیکھ چکی تھی۔ مگر ذہن نے کوئی ایسا تاثر نہیں لیا تھا۔ کسی فرضی مالک کی ملکیت سے شاید اُسے کوئی سروکار نہ تھا۔

اور ___ کتنا خیال تھا اُسے اُس کا ___ مگر ___

یہ سب تو اُس نے اُسے دیکھنے سے پہلے کہا تھا۔ کتنا اچھا انسان تھا۔ بظاہر ایک معمولی سی بات کا کس قدر گہرا تجزیہ کیا تھا۔

وہ یقیناً اداس ہوئی تھی یہ آرام دہ کمرہ دیکھ کر۔ بے شک کہ اُسے اپنی محرومیوں کا احساس ہونے لگا تھا۔

ہاتھ بڑھا کر اُس نے چوڑی کھڑکی کا پردہ سرکایا۔ تاحدِ نظر سمندر کا نیلگوں پانی پھیلا تھا۔

وہ یوں ہی بیٹھی دُور تک پھیلے نیلے پانیوں پر نظریں جمائے تھی۔

کہ پھپھو اندر آگئیں۔

عبدل کہتا تھا اُس نے کافی لگائی ہے یہاں۔ وہ کوٹھی کے بیشتر ملازموں کے نام جانتی تھیں۔ ''میں نے تو کہہ دیا چائے بھیج دے میرے لئے، بھلا میں یہ جلی جلی سی کافی حلق سے اُتار سکتی ہوں...''۔ وہ بھی اُس کے قریب صوفے پر بیٹھ گئیں۔

مشعل کی محویت ٹوٹی۔ وہ دھیرے سے ہنس دی۔ پھپھو نہ ہوتیں تو جانے کیا ہوتا اس کا؟ انہی کے دم سے تو رونق تھی سب۔

نہ چاہتے ہوئے بھی مشعل نے کوفی پی لی۔ اور پھر ___ اُسے لگا۔

وہ کافی بدل گئی تھی۔ حالات اور واقعات نے اُسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔

''فضل کریم کو بھیج دیا ہے میں نے مالک کو تار دلوانے''۔ پھپھو نے بتایا۔ فوراً پہنچنے کو کہا ہے''۔

اور ___ وہ رات وہ خاصی پُرسکون رہی۔

تار ملتے ہی شیر شاہ چلا آیا تھا۔

اتنی جلدی، اتنا فوری ___ وہ سوچ بھی نہیں سکتی۔

کتنا خیال تھا اُسے ان لوگوں کا۔ کتنی فکر رہتی تھی اُسے اُن دونوں کی۔

مشعل کی جان میں جان آگئی۔ سارا خوف، سارا تردد جاتا رہا۔

اُسے لگا اب دنیا کی کوئی طاقت اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اُس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتی۔

قریب ہی پھپھو کے کمرے سے اُس کی باتوں کی دھیمی، مدھم آواز آرہی تھی۔

اور تبھی ___ مشعل کو اندازہ ہوا۔ وہ کتنا چاہنے لگی تھی اُسے۔

وہ اس سے عمر میں خاصا بڑا تھا۔ بہت سنجیدہ، بہت مدبر تھا۔ جاہ و چشم والا تھا۔

اس کے مقابلے میں وہ بہت کم عمر تھی۔ بہت شوخ، بہت چنچل تھی۔ کسی وقت نچلی نہ بیٹھتی تھی۔

بڑا فرق تھا۔ بہت تضاد تھا ___ مگر ___

پھر بھی ___ اُسے پیار تھا اُس سے۔ بہت چاہتی تھی اُسے۔ دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر۔

یہ اندازہ اُسے آج ___ اِس وقت بخوبی ہو رہا تھا۔

اور پھر ___ اس کا جی چاہا۔ وہ اُسے دیکھے، ملے، بات کرے۔

کہ وہ جب سے آیا تھا۔ وہیں بیٹھا پھپھو سے ہی باتیں کیے جا رہا تھا۔

پہنچا بھی دیر سے ہی تھا۔ رات کے کھانے کے بعد ـــــ

کمرے میں کراکری اور کٹلری کا شور سنائی دے رہا تھا۔ شاید ملازم نے اُسے کوفی لا کر دی تھی۔

رات بیتتی چلی جا رہی تھی ـــــ مگر ـــــ باوجود خواہش کے نہ وہ اُس طرف جا سکی۔ نہ ہی وہ اس کے کمرے میں آیا۔

جھنجھلاتے ہوئے ـــــ اُس نے رات کے کپڑے بدلے۔ اور بستر پڑ رہی۔

صبح پھپھو اس کے کمرے میں آئیں۔ تو وہ بے خبر سو رہی تھی۔

دنوں بعد اُسے اطمینان سے سوتا دیکھ کر وہ شفقت سے مسکرا دیں۔

"مشعل بیٹے"۔ انہوں نے اُس کے بال سہلاتے ہوئے اُسے جگانا چاہا۔

اُس کی آنکھیں یکبارگی کُھل گئیں۔ دیکھا ـــــ پھپھو کپڑے تبدیل کیے، بیگ ہاتھ میں لیے تیار کھڑی تھیں۔

"کیا ہے پھپھو"۔

"بیٹے میں جا رہی ہوں گھر کی طرف"۔ وہ اُس کے بستر کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگیں۔

"رات شیر شاہ ـــــ ہمارا کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہم معمول کی طرح اپنا کام جاری رکھیں۔ تمہارا البتہ کہا کہ ابھی چند دنوں کوٹھی سے ہلنے مت دیں۔ اس لئے میں جا رہی ہوں ذرا گھر۔ پتہ نہیں کیا حال ہوگا وہاں۔ آج ذرا اپنے سامنے پولٹری بھی تقسیم کروا لوں گی۔ عبداللہ کو بھی دیکھ آؤں گی۔ شام کو آؤں گی پھر۔ روز کے روز گھر کا چکر لگاؤں گی۔ شام کو تمہارے پاس آیا کروں گی..."۔

"ٹھیک ہے پھپھو"۔ وہ قدرے سوچتے ہوئے بولی۔

"تم یہیں رہنا۔ کوٹھی سے باہر مت نکلنا"۔ انہوں نے تاکید کی۔

"اچھا پھپھو"۔

"شیر شاہ کل واپس جا رہا ہے..."۔ پھپھو مزید بتانے لگیں۔

اور ـــــ اُس کا دل بیٹھ سا گیا۔ ابھی تو وہ اُسے دیکھ بھی نہ پائی تھی۔

"ایک بہت ضروری کیس بہت نازک مرحلے پر چھوڑ آیا ہے"۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

مشعل بھی اٹھ کر بستر میں بیٹھ گئی۔

"اچھا بیٹا خدا حافظ چلتی ہوں دیر ہو رہی ہے"۔

"خدا حافظ"۔ مشعل نے دھیرے سے کہا۔

اور ـــــ باتھ روم چل دی۔

نیم گرم پانی کا شاور لے کر۔ اُس نے مسٹرڈ رنگ کے پھولدار کپڑے پہنے۔ ہم رنگ دوپٹہ لیا۔ اور میچنگ جوتے پہن کر بالوں میں برش کر کے سمندر کی طرف کھلتی کھڑکی کی طرف آ کھڑی ہوئی۔

معاً اُس کی نظر دائیں طرف اٹھی۔ پانی کے اوپر دور تک متوازی پھیلے اکلوتے پام کے درخت کے پاس کوئی پانی میں تیرتا ساحل کی طرف آ رہا تھا۔

اُس کا دل بے ترتیب ہو کر دھڑکا۔ وہ شیر شاہ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

کاسٹیوم پہنے، سنہری دھوپ میں چمکتی ریت پر چلتا ـــــ وہ چھتری کے نیچے آیا۔ وہیں رکھی کرسی کی پشت پر سے اٹھا کر ہاف لینتھ گاؤن پہنا ـــــ اور ـــــ کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔

مشعل بیقرار سی ہو گئی۔ وہ آ کر اُسے ملتا کیوں نہیں تھا۔

جھنجھلائی جھنجھلائی سی وہ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی چیزیں الٹ پلٹ کر رہی تھی۔

تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔

''صاحب ناشتے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں''۔ ملازم نے اطلاع دی۔

اور تھوڑی ہی دیر بعد ـــــ وہ دھڑکتا دل کوٹھی کے وسیع ڈائننگ روم میں داخل ہو رہی تھی۔

کچھ عرصے سے ـــــ جانے کیا ہوا تھا؟ وہ شیر شاہ کے سامنے اپنی ساری چوکڑی بھول جاتی تھی۔ آہستہ قدم اٹھاتی وہ میز تک آنے لگی۔

وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔

کچھ سوچتا ہوا۔ ناشتے میں مصروف تھا۔

وہ بجھ سی گئی، وہ اُس کا انتظار نہیں کر رہا تھا، شروع کر چکا تھا ناشتہ۔

قدموں کی آہٹ پر نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ چند ثانیے تکتا رہا۔

اور پھر ـــــ دوبارہ نظریں پلیٹ پر جما دیں۔

وہ تو بہت ناراض لگ رہا تھا۔ وہ مرجھا سی گئی۔

مستعد بیرے نے لپک کر مشعل کے لئے کرسی شیر شاہ کے دائیں طرف والی کرسی پیچھے کھسکا دی۔

وہ اب بھی پلیٹ پر نظریں جمائے تھا۔

''ہیلو''۔ کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے مشعل نے آہستہ سے کہا۔

''گڈ مورننگ''۔ نظریں اٹھائے بغیر ہی وہ سپاٹ سے لہجے میں بولا۔

اور ـــــ وہ ہمت کھونے لگی۔

''کیسے ہیں آپ؟'' مشعل نے قوت مجتمع کی۔ اُسے حیرت بھی ہوئی اُس نے کم ہی کسی کا حال احوال پوچھا تھا۔

''ٹھیک ہوں''۔ ہاتھ آگے بڑھا کر وہ چائے دانی سے اپنی پیالی میں چائے ڈالنے لگا۔

اور ـــــ مشعل کی نیلگوں آنکھوں میں بدلیاں سی منڈلانے لگیں۔

چند لمحے اُس بے حس سنگین چٹان کو دیکھتی رہی۔

گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پینے کے ساتھ اب اس نے اپنے آگے رکھی ڈاک الٹ پلٹ کرنی شروع کر دی۔

بے اختیار مشعل کا ہاتھ آگے بڑھا۔ اور اس کے لفافہ تھامے ہاتھ پر ٹِک گیا۔

''خفا ہیں مجھ سے''۔ نیلگوں بدلیاں بھیگ گئیں۔

شیر شاہ نے چونک کر اس کے ہاتھ کو دیکھا ـــــ پھر مشعل کو ـــــ چند ثانیے اس کی نم بھیگی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

''نہیں''۔ بے حسی سے کہتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے مشعل کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے ہٹا دیا۔

اور ـــــ اُسے لگا وہ مزید ایک پل بھی یہاں ٹھہری تو اس کی چیخیں نکل جائیں گی۔ سب چھوڑ چھاڑ وہ کمرے سے نکل آئی۔

امڈتے آنسو بمشکل روکے وہ مہمان خانے میں آ گئی۔ اب وہ اور یہاں نہیں رہے گی، اُس نے فیصلہ کر لیا۔ مانا کہ وہ خفا تھا اُس سے ـــــ مگر ـــــ اُسے اپنی توہین بھی لگی، کچھ بھی تھا، وہ اُسکے گھر آ کر ٹھہری تھی اور ـــــ اس سے بہتر سلوک کی مستحق تھی۔

وہ جلدی جلدی سوٹ کیس میں سامان ٹھونسنے لگی۔

دفعتاً ـــــ دروازے میں شیر شاہ نمودار ہوا۔

''کہاں جا رہی ہو''۔ اُس کی آواز میں گرج تھی۔

''پھپھو کے گھر''۔ وہ سوٹ کیس بند کرتے ہوئے ذرا بھی اثر لئے بغیر بولی۔

وہ یہیں آجائیں گی شام کو"۔ اس کا لہجہ اب بھی دبدبہ لئے تھا۔

سوٹ کیس کو پہیوں پر گھسیٹتی وہ دروازے کی طرف آنے لگی۔

"مگر میں وہیں رہوں گی"۔

"میں زیادہ بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ مگر تم یہیں رہوگی جب تک کوئی فیصلہ نہیں ہوجاتا"۔ اس کا اشارہ مسٹر خان کی بات کی طرف تھا۔

"مجھے کسی کا کوئی ڈر نہیں"۔ اُسے ڈر ضرور تھا۔ مگر وہ ڈر اپنی عزت سے بڑھ کر نہیں تھا۔ "نا ہی میں ایک پل اور یہاں رہوں گی"۔

اور ___ شیر شاہ کو مزید کسی بات کا موقع دیئے بنا وہ سوٹ کیس گھسیٹتی کھٹ پٹ کرتی باہر نکل آئی۔

دوپہر کو تھکی تھکائی پھپھو عبداللہ کے ہمراہ گھر پہنچ کر وین سے اُتریں - دیکھا - مشعل باورچی خانے کے دروازے میں کھڑی تھی۔

"تم کیسے آئیں؟" قریب آتے ہوئے پھپھو نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

"میں ___ وہاں نہیں رہوں گی"۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیوں؟" دونوں ہی اندر کچن میں آگئیں۔

اور ___ مشعل نے انہیں ساری بات بتادی۔ کہ اب پھپھو سے اُس کا اور شیر شاہ کا تعلق ڈھکا چھپا نہیں تھا۔

"کچھ بھی تھا میں اُس کے گھر مہمان ٹھہری تھی..."۔

پر ___ جانے کیوں؟ ساری بات سنکر پھپھو ہولے سے مسکرادیں۔

مشعل کی بات اپنی جگہ ٹھیک تھی مگر ___ کچھ روز قبل اُس نے شیر شاہ کی سالگرہ پر جو کیا

تھا۔ اور جو بہت ساری اداسی، ڈھیر سارا دُکھ اور بے اندازہ توہین، اُس آدمی نے چُپ چاپ برداشت کرلی تھی۔ جو ٹیس دل ہی دل میں اٹھ رہی تھی، جو چنگاری من ہی من میں سلگ رہی تھی، اور جو لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ اس کا ردعمل اتنا تو ہونا ہی تھا۔

"پھر کہتا تھا، تم یہیں رہوگی جب تک کوئی فیصلہ نہیں ہوجاتا..."۔ اُس نے شیر شاہ ہی کے لہجے میں بھاری سی آواز نکال کر کہا۔

اور ___ پھپھو جیسے اپنی سوچوں سے چونکیں۔

"ہاں تو ___ ٹھیک تو کہتا تھا"۔ مسٹر خان کی طرف اشارہ سنتے ہی اُن کے اوسان پھر خطا ہونے لگے۔ "آؤ کھانا کھاتے ہیں پھر چلتے ہیں وہیں..."۔ وہ چولہے کی طرف بڑھیں۔

"نہیں پھپھو ___ میں اب وہاں نہیں جاؤں گی"۔ اس کی خودداری آڑے آرہی تھی۔

"ارے کیوں نہیں جاؤ گی ۔ وہ کوئی غیر تھوڑی ہے"۔ وہ ترکاری گرم کرتے ہوئے بولیں۔

"نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی"۔

"ضد نہیں کرتے۔ ہمارے حالات ہی ایسے ہیں۔ اب اکیلے نہیں رہ سکتے..."۔

"نہیں پھپھو..."۔ وہ ناخن سے دروازے کی پینٹ کھرچتے ہوئے اپنی ضد پر قائم رہی۔

"تو پھر کیا کریں گے"۔ وہ ترکاری ڈونگے میں ڈالتے ڈالتے کچھ جھنجلائی سی بولیں۔ اُن کی جھنجلاہٹ میں پریشانی تھی، فکرمندی تھی، اور مشعل کی بزرگ ہونے کے ناطے قدرے ڈانٹ بھی۔

آخر وہ سب جانتی تھیں۔ کل کلاں کو کچھ ہوجاتا تو؟

گو شیر شاہ نے رات انہیں بہت سی تسلی دی تھی۔ اُس کے جزیرے پر اُس کی اجازت کے

بغیر کوئی قدم بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ کہاں کہ آ کر مشعل کو اٹھا کر لے جائے ـــــ مگر ـــــ اُس نے یہ بھی تو کہا تھا کہ وہ دونوں بہر حال اُسی کوٹھی میں رہیں۔ جب تک کہ وہ ساری بات سنبھال نہیں لیتا۔

''پھپھو ہم لوگ ـــــ وطن کیوں نہیں چلے جاتے ...؟'' اُس کی خوبصورت آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ آواز رقت آمیز ہو گئی۔

یہی بہتر تھا اُس کے خیال میں۔ وہاں بیرسٹر انکل تھے۔ رحمت بابا تھے۔ اپنا وطن تو تھا۔ وہاں وہ دونوں زیادہ محفوظ محسوس کرتیں۔

پھپھو نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''میں نے بھی یہی سوچا ہے بیٹا''۔

کل رات وہ واقعی یہی سوچ رہی تھیں۔ مشعل کو اپنے وطن لوٹ جانا چاہیئے تھا۔ اُس کی عمر پردیس میں بھٹکنے کی نہیں تھی۔

شیر شاہ نہ ہوا تو کوئی اور بَر اُسے مل جاتا۔ اب اُسے مرد کے سہارے کی ضرورت تھی۔ پھپھو اُسے ایسے حالات میں سہارا دینے سے قاصر تھیں۔ خود ہی عورت تھیں، وہ بھی کمزور سے دل کی مالک ڈرپوک سی۔

مگر ـــــ ساتھ ہی انہوں نے سوچا تھا وہ بھی جائیں گی۔

مشعل کو ایک پل اکیلا نہیں چھوڑیں گی۔ حالات چاہے کچھ بھی ہوں، کیسے بھی ہوں۔ ورنہ ان کے منہ بولے بھائی کی روح بیقرار ہو گی۔ قیامت کے روز انہیں منہ نہ دکھا سکیں گی۔

''پولٹری کا کام وام سمیٹ کر شیر شاہ سے بات کروں گی کسی اور کے ذمے لگا دے اور ـــــ ہم دونوں واپس چلی چلیں گی''۔ کھانے کی ٹرے ہاتھوں میں لئے وہ لاؤنج میں آنے لگیں۔

اداس اداس، چپ چپ سی وہ بھی میز پر آ گئی۔

چند نوالے لے کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ بستر پر پڑ کر بے اختیار اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

گھر سے بے گھر ہو کر وہ یہاں آئی تھی۔ ساری جائیداد چھن گئی تھی، گھر تک نہ رہا تھا۔ گم سم سی وہ اس جزیرے پر پھپھو کے یہاں پہنچی تھی۔

اتنا اچانک اور اتنا جلدی ہوا تھا سب کچھ ـــــ کہ اُسے پچھلی باتیں سوچنے تک کا موقعہ نہ ملا تھا۔

مگر ـــــ جب پھپھو نے اُسے کلیجے سے لگا لیا تھا۔ اپنی اولاد کی طرح پیار کیا تھا، اپنے خون کی طرح دیکھ بھال کرنے لگی تھیں۔ تو اس نے ـــــ حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

ایسے میں اُسے شیر شاہ کا پیار ملا۔ تو وہ بہت حد تک بہل گئی۔

مگر شاید ـــــ اس کی قسمت میں سکھ کی، چین کی گھڑیاں کم ہی تھیں۔ وقتاً فوقتاً اُسے مسٹر خان کی طرف سے ایسی باتیں سننے کو ملیں کہ اس کا جی جل جل گیا۔ اور پھر ـــــ

ایک ایسی قابل نفرت ہستی جس سے اس کا رواں رواں نفرت کرتا تھا۔ اُسی سے ہی شادی کا تقاضا کر بیٹھے! یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔

انہی نفرتوں میں آپے سے باہر ہو رہی تھی کہ۔

خبر ملی ـــــ وہ یہاں آ کر اُسے اُٹھا لے جانے کی سوچ رہا تھا۔

کیا نہ بیتی تھی اُس کے دل و دماغ پر۔ کیا ہنگامے نہ اٹھے تھے اُس کے ذہن و من میں۔

اور پھر ـــــ ایک چھوٹی سی، ناتواں سی لڑکی ہونے کے ناطے۔ اُسے خوف محسوس ہوا تھا، ڈر بھی تو لگا تھا۔

ایسے میں پھپھو نے اُسے شیر شاہ کی آس دلائی۔ اُسے اُس کی کوٹھی پر لے گئیں۔

وہ بھی اِس مان پر گئی۔ کہ شیر شاہ اس سے بے پناہ محبت جو کرتا تھا۔ ہونہہ۔

اُس نے اپنے بھیگے گال انگلیوں کی پوروں سے صاف کئے۔

اچھی محبت تھی اس کی ـــ وہ تو کتنا کتنا بیقرار رہی تھی اُس کے لئے۔ اور وہ ملا تو ـــ کتنا سرد رویہ تھا ـــ بلکہ تضحیک آمیز بھی۔

کتنا بدل گیا تھا۔ پیار نہیں رہا تھا شاید اُس سے۔

اور ـــ سوچتے ہی وہ چونک اٹھی۔

پیار نہیں رہا تھا اُس سے؟ معصوم سی جان دھڑکتے دل سے دہرایا۔

ہاں ایسا ہی تھا۔ من نے کہا۔

اور وہ ـــ وہ تکیے میں منہ دے کر بے اختیار رو دی۔

اُس نے وطن واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اُس سے شیر شاہ اور اس سے وابستہ اِس جزیرے کی مختصر سی مگر بہت قیمتی یادیں ـــ سب چھن رہی تھیں۔

کیا وہ اتنی آسانی سے اُسے بھول پائے گی؟

مگر ـــ ایسا تو کرنا ہی ہوگا۔ ایسا تو ہونا ہی تھا۔

شیر شاہ نے بھی کون سا اُس سے عمر بھر ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائی تھیں۔ بلکہ ـــ اُس نے تو کبھی ـــ بلکہ دونوں نے کبھی سنجیدگی سے تو اس مسئلے پر بات ہی نہ کی تھی۔ زیادہ سے زیادہ شیر شاہ اُسے تنگ کرتا، چھیڑتا، بچوں کی طرح برتاؤ کرتا۔ وہ بھی ـــ وہ بھی اُس کی سنگت مین خوش رہتی اور بس۔

آئیندہ کیا ہوگا؟ کیا ہونا تھا؟ یہ تو کبھی ذکر ہی نہ ہوا تھا۔

کیا کرتے ہیں لوگ؟ کیا کہتے ہیں؟ آنسو پونچھتے ہوئے اُس نے معصومیت سے سوچا۔

"WILL YOU MARRY ME?"۔ اُسے اچانک پچھلے دنوں پڑھے ناول

میں ہیرو کی ہیروئین سے کہی بات یاد آ گئی۔

اور ـــ اُسے شرم کے ساتھ ساتھ گھبراہٹ بھی ہوئی۔

یہ انجام ہوتا ہے محبت کرنے کا؟

پر ـــ اُسے کیا ملا؟

اور ـــ اُسے اچانک شیر شاہ سے نفرت سی محسوس ہوئی، غصہ سا آنے لگا اُس پر۔

اور پھر ـــ اُس نے فیصلہ کر لیا وہ اُس سے کبھی نہیں ملے گی۔ عزم کر لیا، کبھی اُسے یاد نہیں کرے گی۔

"بیٹے میں نے سوچا ہے"۔ اچانک پھپھو اندر داخل ہوئیں۔ "ہمیں اس گھر میں ایک دن بھی نہیں رہنا چاہیئے"۔ وہ اُس کے بستر کی پٹی پر آ کر بیٹھ گئیں۔

"تو؟" وہ بستر میں اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے پریشان سی اُنہیں دیکھنے لگی۔

"اوّل تو ہم دونوں کو شیر شاہ کے یہاں ٹھہرنا چاہیئے جب تک کہ وطن واپسی کا کوئی بندوبست نہیں ہو جاتا..."۔

"مگر..."۔

"اور اگر ـــ تم بالکل ہی وہاں جانے کے حق میں نہیں ہو ـــ تو پھر میں نے اور ہی سوچا ہے..."۔

"کیا؟" وہ پُر امید سی نظر آنے لگی۔

"تمہیں چھوڑ آتی ہوں پرلے جزیرے پر فاطمہ کے یہاں"۔ انہوں نے اپنی دوست کا نام لیا۔ "وہ تمہارا ہر طرح کا خیال رکھے گی۔ میں رہ لونگی یہاں مالک کے ہاں ـــ کہ لنگر خانے کا سارا کام بھی تو اُس کے حوالے کرنا ہے۔ پھر وطن واپسی کا بندوبست وغیرہ بھی وہیں سے کروں گی..."۔

''ٹھیک ہے''۔ چاروناچار اُسے حامی بھرنا ہی پڑی۔

گوکہ اُسے یہاں ہر طرح کا آرام تھا۔ مگر واقعی وہ لوگ یہاں نہیں رہ سکتی تھیں۔ کسی بھی وقت مسٹر خان کچھ بھی کر سکتا تھا۔

اور شیر شاہ کے یہاں ـــــ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ پھر سوائے پھپھو کی تجویز کے اور چارہ بھی کیا تھا۔

ایک بار پھر ـــــ اس نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا۔

اور ـــــ بے حد اداس، بے حد دکھی۔ کمرے سے نکل آئی۔

گھر کو تالا لگا کر ـــــ پھپھو بھی نکل آئیں۔

عبداللہ نے اُس کا سوٹ کیس اٹھایا۔ اور تینوں پیدل ساحل کی طرف چل پڑے۔

یہ وہی راستہ تھا۔ درختوں میں گھرا، سوکھے پتوں سے اٹا۔ جس پر وہ پہلی بار، شیر شاہ کے ہمراہ پھپھو کے یہاں آئی تھی۔

اُس نے نم آنکھیں پونچھ لیں۔ اُسے شیر شاہ کے لئے، اپنے دربدر ہونے پر رونا آ رہا تھا۔

آج پھر وہ نئی جگہ، نئے ماحول میں جا رہی تھی۔

کشتی میں بیٹھ کر اُس نے اداسی سے اردگرد دیکھا۔ جانے کیا ہونے والا تھا آگے؟

''تم دکھی نہ ہو''۔ میں زیادہ دن نہیں لگاؤں گی''۔ پھپھو نے اُسے تسلی دی۔ ''تمہیں چھوڑ کر میں سیدھی مالک کے یہاں جاؤں گی۔ ساری بات کروں گی اُس سے۔ اب اور یہاں رہنا ہمارا ٹھیک نہیں۔ کنگڑ خانے کا انتظام فی الحال اُس کے ملازم سنبھال لیں گے۔ بعد میں کوئی نہ کوئی بندوبست کر ہی لے گا۔ چند روز لگیں گے ضرور ـــــ کئی جگہوں پر حساب کتاب کرنا ہوگا۔ ملازم کو کام سمجھانا ہوگا۔ ویزا لگوانا ہوگا، ٹکٹ وغیرہ ـــــ بہتیری جھنجھٹ ہے۔ کچھ وقت لگے گا ہی ـــــ پھر ـــــ الوداع کہہ ہی دیں گے...''۔ پھپھو کی بھی آنکھیں نم ہوگئیں۔

شاید اس لئے کہ مشعل دربدر پھر رہی تھی۔

شاید اس لئے کہ اچھے خاصے رہ رہے تھے کہ ظالم خان سے زندگی دوبھر کر دی۔

اور شاید اس لئے بھی کہ یوں اچانک چھوڑنا پڑ رہا تھا اس جگہ کو جہاں سوچا تھا زندگی بھر رہیں گے بس، اُنسیت سی ہوگئی تھی اس جگہ سے، اس جگہ کے لوگوں سے، ماحول سے۔

مشعل بھی بے چین ہوگئی۔ اپنی تو جو قسمت لے کر آئی تھی سو تھی ـــــ ساتھ میں بچاری پھپھو کو بھی گھر سے بے گھر کئے جا رہی تھی۔

آگے ہی آگے بڑھتی کشتی مشعل کی اداسیوں کو مزید بڑھا رہی تھی۔

پھپھو نے سارا کام، مکان، وین یہاں تک کہ عبداللہ کو بھی مالک کے ملازموں کی نگرانی میں دے دیا تھا۔

اُن کا اور مشعل کا وطن واپسی کے ٹکٹ بھی آ چکے تھے۔

کل اُن دونوں نے چلے جانا تھا۔

چھوٹے سے جزیرے کے تقریباً تمام مکینوں سے آخری بار مل ملا کر وہ مالک کے یہاں چلی آئیں۔

تھوڑی دیر ستانے کے بعد سوچا تھا سامان لے کر مشعل کے پاس پرلے جزیرے پر چلی جائیں گی۔ وہاں سے ایئر پورٹ زیادہ نزدیک تھا۔ رات وہیں رہ کر اگلے دن دونوں پرواز کر جائیں گی۔

"بیگم صاحب۔ تار ہے میم صاحب کا"۔ مہمان خانے کی طرف جاتے ہوئے تار کا لفافہ ہاتھ میں لئے شیر شاہ کا ملازم خاص ملا۔ "ڈاکیہ پہلے آپ کی طرف گیا تھا مگر آپ نہیں ملیں تو یہاں لے کر آ گیا"۔

"ذرا پڑھنا تو"۔ وہ انگریزی نہ جانتی تھیں۔

ملازم نے لفافہ کھولا۔ کاغذ نکالا۔

"ذوالفقار علی کا کیس ہم جیت گئے ہیں۔ اب ان کی ساری ملکیت ساری جائیداد کا وارث

تمہیں قرار دیا جاتا ہے۔ عرفان احمد"۔

"کیا لکھا ہے پھر سے کہو..."۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

ملازم نے ایک بار پھر تار کا مضمون دہرایا۔

"ارے"۔ پھپھو نے جلدی سے تار اُس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ سچ تو کہہ رہے ہو نا"۔ وہ مضمون پر نظریں یوں دوڑانے لگیں جیسے اچانک انگریزی دان ہو گئی ہوں۔

"ارے تمہارے منہ میں گھی شکر"۔ انہوں نے تار چوم لیا۔ آنکھیں خوشی سے بھر آئیں۔" ارے میرے بچی کہاں ہے۔ دکھ سہہ سہہ کر آدھی رہ گئی۔ ارے دشمن بھی وہ دُکھ نہ دیکھے جو اُس نے سہے۔ ارے..."۔ وہ ساڑھی کے پلو سے آنکھیں پونچھتے پونچھتے کہتی گئیں۔

"آپ۔ یہ پانی لیجئے بیگم صاحب"۔ اُسی ملازم نے اُنہیں پانی لا کر دیا۔

شیر شاہ کے تمام ملازم پھپھو کی بہت عزت کرتے تھے۔ سمجھتے تھے مالک بھی عزت دیتا ہے۔ پھر یہ ملازم تو ___ اور بھی بہت کچھ ___ سمجھنے لگا تھا۔

اپنے مالک اور مشعل کے من کا راز بھی۔ پھر مشعل انہی بیگم صاحب کے یہاں تو رہتی تھی۔ ان کی عزت وہ پہلے سے بھی بڑھ کر کرنے لگا تھا۔

"اے بھائی"۔ پانی پیتے پیتے وہ کہنے لگیں۔ "کہاں کا ستانا۔ اٹھاؤ میرا سامان اور ڈالو وین میں۔ میں ابھی جاؤں گی اپنی بچی کے پاس..."۔

اور ___ کوٹھی کے سب ملازموں سے مل ملا ___ وہ سیدھی چل دیں ساحل پر۔

مشعل اور پھپھو کو وطن آئے کئی دن ہو گئے تھے۔ وہ دونوں اب بھی بیرسٹر عرفان کے یہاں مقیم تھیں۔ گو انکل نے کہا تھا وہ چاہے تو اپنی کوٹھی میں شفٹ ہو سکتی ہے کہ مسٹر خان نے اُس کوٹھی کی واپسی کے کاغذات ایک بار پھر بیرسٹر انکل کو بھجوا دیئے تھے، ساتھ ہی کوٹھی کی تمام چابیاں اور ساتھ ہی اُس کی گاڑی کی چابیاں بھی ـــــ مگر ـــــ

اُسے تو ایک خبط سوار تھا۔ اُس وقت کوٹھی میں قدم نہیں رکھے گی جب تک کہ مسٹر خان کو اس کی ادائیگی نہ کر دے۔ ایک ایک پائی نہ چُکا دے اُس کی۔

اُس کے وطن آتے ہی دوبارہ کوٹھی کے کاغذات بھجوانا، دوسرے لفظوں میں اُسے مراعات مہیا کرنا اُسے اور بھی آگ لگا گیا تھا۔ ایک ایک دن ایک ایک پل گن رہی تھی۔ اُسے رقم چکانے کی ـــــ مگر ـــــ یہ سب اُس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک کہ اُسے اپنی جائیداد اور املاک کا کیس جیتنے کے تحریری ثبوت نہ مل جاتے۔

اور آج ـــــ وہ دن آ گیا تھا۔ کل ہی انکل نے آخری کاروائی مکمل ہونے پر تمام دستاویزات اُس کے حوالے کر دیئے تھے۔

صبح جوں ہی انکل اپنی گاڑی ڈرائیو کرتے آفس جانے کیلئے گیٹ سے باہر نکلے۔ اُس نے آنٹی سے اپنی دیرینہ دوست سے ملنے کا کہتے ہوئے اُن کے ڈرائیور کو اپنی گاڑی کی چابی دے کر اپنی کوٹھی پر اپنی گاڑی لینے بھگایا۔ وہ ایک پل ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ آج وقت آ گیا تھا۔ وہ

یہ کاغذات لے جا کر مسٹر خان کے منہ پر دے مارے گی۔ اُسے بتا دے گی کہ اُس نے تو اپنے تئیں اُسے پائی پائی کا محتاج کر دیا تھا۔ جائیداد سیل کروا لی تھی، مکان چھین لیا تھا۔ مگر۔ یہ سب اس کا خواب نکلا۔ حقیقت ان کاغذات میں تھی۔ اور وہ ان سب کی وارث۔ وہ کہہ دے گی اُسے کہ وہ اُس کے خیرات کی خواہش مند نہیں۔ یہ کاغذات اُس کی گردی رکھوائی کوٹھی کو چھڑوائیں گے۔

اور ـــــ اس وقت اپنے سینکڑوں بار سوچے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے وہ تیزی سے شہر سے باہر مسٹر خان کے آفس چلی جا رہی تھی۔ مسٹر خان کے آفس کا اُسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ پچھلے چند دنوں میں مسٹر خان کا تذکرہ گھر میں عام تھا۔

وہ آنٹی وانکل سے چوری جا رہی تھی۔ کہ کل ہی جب اس نے انکل کے سامنے کہا تھا کہ وہ کہ سیدھے اس منحوس کے آفس جا کر اپنی جائیداد کے کاغذ اُس کے منہ پر دے مارے۔ تو انہوں نے بختی
سے اُسے منع کر دیا۔

''ایسا سوچنا بھی نہیں۔ تمہیں اُس کے پاس جانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے ـــــ وہ ـــــ اچھے کردار کا انسان نہیں ہے...''۔ انہوں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ مگر۔

اُس کے تو من میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اُس نے اُسے جائیداد سے بے دخل کرایا، گھر سے بے گھر کیا اور اب ـــــ اُس سے شادی کا تقاضا کر رہا تھا، منہ نوچ لے گی وہ اس کا، آنکھیں پھوڑ دے گی، جان سے مار ڈالے گی....

وہ کتنی رفتار سے جا رہی تھی؟ سامنے سے آنے والی گاڑیوں سے کتنی بار ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی؟ اُسے کوئی ہوش نہیں تھا۔ ہوش تھا تو صرف ایک بات کا ـــــ کہ کاغذات منہ پر دے مارنے تھے مسٹر خان کے اور منہ نوچ لینا تھا اس کا اس سے شادی کی بات پر ـــــ

پھر ـــــ اس کی محویت ٹوٹی۔ مسٹر خان کی ٹکیسٹائل مل کے گیٹ پر کھڑا چوکیدار اس کے لئے

گیٹ کھول رہا تھا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ ایک طرف گاڑی روک کر لفافہ میں رکھے جائیداد کے کاغذات لئے وہ آگے بڑھی۔

''مسٹر خان کہاں ہوتا ہے؟'' اس نے سامنے سے آنے والے ایک آدمی سے پوچھا۔

''اپنے آفس میں ہوتے ہیں''۔

''کہاں ہے اس کا آفس؟''

''وہ ـــ مل کے اس طرف''۔ آدمی نے مل کے آخری سرے سے لگے آفس کی طرف اشارہ کیا۔

اور وہ کھٹ پٹ کرتی اُس طرف بڑھی۔

''ٹھک ٹھک''۔ دروازے پر پہنچ کر اُس نے دستک دی۔

''یس''۔

اور وہ ـــ اندر داخل ہوگئی۔

''اخاہ۔ مس ذوالفقار علی ہیں''۔ تو وہ دیکھ چکا تھا اُسے پہلے بھی، بڑی سی میز کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر بیٹھا یہ یقیناً مسٹر خان تھا۔

''میری جائیداد مجھے واپس مل گئی ہے۔ یہ کاغذات ہیں''۔ اُس نے میز پر اُس کے آگے لفافہ پٹخا۔

''آپ''۔ اُس نے سر سے لے کر پاؤں تک اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ''بیٹھئے تو سہی''۔

وہ پچاس پچپن کا تھا، بھدی سی شکل تھی اور مکروہ مسکراہٹ۔

آج پہلی بار وہ اُس شخص کو دیکھ رہی تھی جس سے ایک عرصہ سے وہ نفرت کرتی آئی تھی۔

پل پل، لمحہ لمحہ۔

''میں بیٹھنے نہیں آئی''۔ اُس کے لہجے میں حقارت انتہا پر تھی۔ ''میں چیک دینے آئی...''۔

اور ـــ اَن سُنی کرتے ہوئے اس کا مکروہ سا قہقہہ بلند ہوا۔

''تم جاؤ''۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے قریب ہی کھڑے شاید اپنے چپڑاسی وغیرہ سے کہا۔

اور وہ چل دیا۔

''بڑے دنوں بعد دیکھا ہے آپ کو''۔ اس کا لہجہ غلیظ سا تھا۔ ''بیٹھئے نا''۔

''میں نے کہا نا میں بیٹھنے نہیں...''۔

''ارے کیسے نہیں بیٹھیں گی آپ''۔ اُس نے بے تکلفی سے اُسے ہاتھ سے پکڑا۔

مشعل سُن سی رہ گئی۔ اگلے ہی لمحے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''اچھا بتایئے۔ میری تجویز آپ کے گوش گزار کی بیرسٹر عرفان نے یا نہیں؟'' وہ کھسیانا سا کہنے لگا۔

تجویز ـــ وہ جانتی تھی اُس کی تجویز کیا تھی!

''مجھے آپ کی کسی تجویز کا کوئی علم نہیں''۔ تن بدن میں اٹھتے شعلوں کی لپیٹیں بمشکل برداشت کرتے ہوئے وہ انجان بن گئی۔

اور ـــ ایک بار پھر اس کا وہی مکروہ قہقہہ گونجا۔

''غصہ میں آپ اور بھی اچھی لگتی ہیں مگر۔ میری تجویز پر عمل کرنے سے ہم دونوں کا فائدہ ہوگا...''۔

معاً ایک اُدھیڑ عمر شخص اندر داخل ہوا ـــ اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

مشعل پیچ و تاب کھاتی رہ گئی۔

"آپ یہ پاس والے کمرے میں بیٹھیے میں فارغ ہو کر آپ سے بات کرتا ہوں"۔ اُس نے جلدی سے مشعل سے کہا۔

"آیئے جناب"۔ اٹھتے ہوئے اُس نے آنے والے شخص کو خیر مقدم کیا۔

اور ۔۔۔ جز بز ہوتی مشعل اپنے کاغذات کا لفافہ میز پر سے اٹھا کر پردہ ہٹاتی پاس والے کمرے میں آ گئی۔

قیمتی قالین، قیمتی پردے تھے۔ آرام دہ صوفہ تھا، فرج، ڈیک، ٹیلی ویژن سیٹ تھا۔ فارغ اوقات میں مسٹر خان کے ستانے کا کمرہ۔

لفافہ ہاتھ میں لئے وہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھیں۔ جو جو باتیں وہ راستہ بھر سوچتی آئی تھی، ٹھیک سے کر نہ پائی تھی مسٹر خان کے آگے۔ ایک تو وہ اُسے بات ہی نہ کرنے دے رہا تھا۔ اوپر سے اس کا غلیظ سا لب ولہجہ، مکروہ مسکراہٹ۔ اور پھر بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑ لینا۔ سب اُس کے اوسان خطا کئے دیتے تھے۔

کوشش کے باوجود اپنے آپ کو توازن نہ دے پا رہی تھی۔ اتنی گندگی نظریں، اتنی سستی بول چال سے اس سے قبل اس کا واسطہ نہ پڑا تھا، اس لئے شاید۔

"کون ہے یار؟" اچانک اس کے کانوں میں آواز پڑی۔ آنے والے آدمی کا لب ولہجہ بھی بہت گندا تھا۔

پھر ۔۔۔ دونوں کا قہقہہ ایک ساتھ بلند ہوا۔

مسٹر خان آہستہ آہستہ کچھ بتانے لگا۔ وہ سن نہیں پائی ۔۔۔ مگر ۔۔۔

اُس کا دل بے اختیار دھڑک اُٹھا۔ انکل نے ٹھیک کہا تھا۔ اُسے یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا۔

وہ ڈھکا چھپا نہیں کھلم کھلا اوباش لگ رہا تھا۔ ناتجربہ کار ہوتے ہوئے بھی وہ اُس کی گندی نظریں، پست باتیں، فضول مسکراہٹیں سمجھ رہی تھی۔

"ہیلو سر"۔ اب کے ایک نسوانی آواز اُبھری۔ شاید سیکرٹری وغیرہ تھی اس کی۔

"آؤ آؤ"۔ مسٹر خان کا وہی بے تکلف لہجہ تھا۔ "اندر جاؤ۔ ہماری مہمان ہیں۔ کولڈ ڈرنک پلاؤ اُنہیں، ہم تب تک فارغ ہو کر آتے ہیں"۔

"لیس سر"۔

اور ۔۔۔ عجیب ننگا ننگا سا ڈریس پہنے ایک لڑکی کمرے کے اندر آ گئی۔

یہ تمام ماحول اُس کے لئے انوکھا سا تھا۔ وہ پریشان سی کھڑی آنے والی لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔

پھر وہ چونکی۔ مخالف سمت کے دروازے سے ایک جوان آدمی اندر آیا تھا، بغیر اجازت، بغیر کچھ کہے سنے۔ گنجا سر، گھورتی آنکھیں لئے وہ سیدھا کونے کی میز پر گیا اور میوزک آن کر دیا۔

وہ اب بھی وہیں کھڑی الجھی الجھی سی ارد گرد دیکھ رہی تھی۔

لڑکی نے اُسے بیٹھنے کا کہہ کر آگے بڑھتے ہوئے سامنے کا فرج کھول لیا۔ کولڈ ڈرنکس نکالنے لگی تھی شاید۔ اُس نے دیکھا وہسکی کی بوتلیں سجی تھیں وہاں ۔۔۔

اور ۔۔۔ تبھی اُس نے سوچا اُسے مسٹر خان کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے۔ چیک ہی دینا تھا انکل کے ذریعے دلوا دے گی۔ یہ ماحول اُس کے بیٹھنے کا نہیں تھا۔

گنجا آدمی میز سے گلاس لے کر میوزک کی دھن پر جھومتا فرج کے پاس گیا اور آرام سے وہسکی کی بوتل کھول کر اس میں ڈالنے لگا۔

وہ بوکھلا گئی۔ کیا ہو رہا تھا یہ سب؟

خوفزدہ ہو گئی۔ اُسے کوئی نقصان پہنچا تو؟

کیسا نقصان؟ ذہن تفصیل میں جانے کے قابل نہیں تھا ۔۔۔ مگر ۔۔۔ چھٹی حس کہہ رہی تھی یہ سب اچھا نہیں تھا۔

اور ـــــ ڈرنک کی بوتلیں لیئے لڑکی سے ٹکراتی۔ بھاگتی ہوئی وہ مخالف دروازے سے باہر نکل گئی۔

پھر ـــــ وہ وہاں بھی رُکی نہیں۔ بغیر کسی تعین کے تیز تیز چلتی رہی۔ جیسے کوئی پیچھا کر رہا ہو۔ جیسے کوئی پکڑ ہی لے گا آ کر۔

دھڑکتا دل لئے وہ گاڑی تک آئی۔ سٹارٹ کی اور پلٹتے ہوئے تیزی سے گیٹ سے باہر نکل آئی۔

''سناؤ بھئی آج کیا مصروفیات رہیں؟'' شام کو لان میں کرسیوں پر بیٹھے انکل نے چُپ چُپ سی مشعل سے پوچھا۔

''آج تو اپنی گاڑی منگوا کر اپنی دوست کے یہاں گئی تھی مشعل''۔ آنٹی نے خوشی خوشی بتایا۔

اور گھبرا کر مشعل انکل کی طرف دیکھنے لگی۔ اُن کے منع کرنے کے باوجود وہ ایسی جگہ گئی تھی جس کے ماحول کا اثر اس وقت بھی اُس کے ذہن پر بُری طرح سوار تھا۔

''ویری گڈ۔ بہت اچھا کیا تم نے۔ گاڑی اب تمہاری ہے۔ فرینڈز کے پاس آیا جایا کرو دل لگا رہے گا''۔

پھپھو سامنے ہی قدرے فاصلے پر جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہی تھیں۔

آنٹی بھی نماز پڑھنے اُس طرف چلی گئیں۔

''ویسے بیٹے ـــــ مسٹر خان کا تقاضا اب بھی اپنی جگہ ہے''۔ سامنے دیکھتے ہوئے پھر بولے۔ ''کل ہی اُس نے یاد دہانی کرائی ہے''۔

''میری تجویز آپ کے گوش گزار کی بیرسٹر عرفان نے یا نہیں؟'' آج صبح مسٹر خان یہی تو

کہہ رہا تھا۔

اس کی عمر، اُس کی شکل، اُس کی مکروہ ہنسی۔

وہ کانپ سی گئی۔

''مگر انکل ـــــ یہ نا ممکن ہے''۔ اُس نے احتجاج کیا۔

''یہی تو میں نے کہا تھا اُسے''۔

''پھر؟'' وہ امید وبیم کی حالت میں انہیں دیکھنے لگی۔

''بڑا ڈھیٹ ہے کہنے لگا وہ نا ممکن کو ممکن بنا دے گا''۔

اس کی گندی نگاہیں، پست لب ولہجہ، غلیظ قہقہے۔

مشعل کو جھرجھری سی آ گئی۔

''انکل۔ آپ مجھ سے چیک لے کر ادائیگی کر دیں تا کہ میں اور پھپھو اپنے گھر چلی جائیں''۔ کوٹھی چھڑوا کر کم از کم واسطہ تو ختم کر لینا چاہیئے تھا اُس سے۔

''جانے کو تم اس وقت بھی جا سکتی ہو وہ تمہیں روکے گا تھوڑی...''۔

''نہیں انکل۔ بغیر اُسے رقم ادا کیے میں نہیں جاؤں گی''۔

ٹھیک ہے۔ تم چیک لکھ دو میں دے آؤں گا''۔

چیک دے دینے کے بعد وہ اپنی بات سے باز آ جائے گا، کیا گارنٹی تھی اِس کی؟

پریشان سی وہ سوچنے لگی۔

اور ___ پھر اُسے اپنی کوٹھی واپس مل گئی۔

پوری کوٹھی کی صفائی ہوئی، جھاڑ پونچھ ہوئی۔ لان کی گھاس کاٹی گئی۔

غرض ہر چیز ٹھیک ٹھاک ہوئی تو وہ اور پھپھو اپنے گھر آ گئیں۔ عرصہ بعد جہاں اپنی چھت ملی وہاں اپنے پاپا کو نہ پا کر وہ بے اختیار رو دی۔

"روئیے نہیں بیٹا"۔ رحمت بابا نے نم آنکھوں سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "خدا آپ کو زندگی دے۔ یہ گھر پھر سے آباد ہو جائیگا کس نے سوچا تھا۔

"نہ رو میرا بچہ"۔ پھپھو نے آنسو پونچھتے ہوئے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ "بھائی صاحب کی روح کو تکلیف ہوگی۔ آؤ تمہیں تمہارے کمرے میں لے چلوں"۔

اور وہ دونوں مشعل کے کمرے میں آ گئیں۔

ہر چیز جوں کی توں تھی۔ اُس کی آنکھوں میں بے اختیار تشکر کے آنسو اُمڈ آئے۔

واقعی خدا کے یہاں دیر تھی اندھیر نہیں۔

"خدا کتنا مہربان ہے نا پھپھو"۔ وہ معصومیت سے بولی۔

"تمہاری سوچ سے بھی کہیں زیادہ مہربان ہے۔ تم کیا جانو ستر ماؤں کی محبت رکھتا ہے"۔

رات ڈنر پران کے پرانے خانسامے نے آج اُس کی پسند کے کھانے بنائے تھے۔ مطمئن سی وہ اور پھپھو کھانے میں مصروف تھیں۔

"ساری پراپرٹی مل جائے گی تو شاندار پارٹی لیں گے آپ سے"۔ اُسے چند روز قبل بیرسٹر آنٹی کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔

"ایک شرط ہوگی پارٹی صرف خواتین کی نہیں ہوگی، ہماری بھی ہوگی۔ بیٹی جتنی تمہاری ہے اتنی ہماری بھی ہے"۔ انکل نے برجستہ کہا تھا۔

"پھپھو ہمیں فوراً ایک زبردست ڈنر دینا چاہیئے"۔ مشعل خوش خوش بولی۔

"ضرور دیں گے پر اتنا بڑا بندوبست کون کرے گا"۔ پھپھو مزے لے لے کر کوفتے کھاتے ہوئے بولیں۔

"بیرسٹر انکل کریں گے نا"۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے"۔

اور پھر رات سونے سے قبل اُس نے انکل سے فون پر بات کر کے اگلے ہفتے میں ڈنر کا دن مقرر کر لیا۔ سارا بندوبست، کارڈز چھپوانے اور تقسیم کروانے تک کا انکل نے اپنے ذمے لے لیا۔

رات اُسے دیر تک نیند نہیں آئی۔ ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ پاپا کی وفات، جائیداد کا ضبط ہونا، گھر سے بے گھر ہو کر۔ جزیرے پر رہنا۔ شیر شاہ۔۔۔

اور یہاں تک آ کر وہ اُس کا خیال جھٹک دیتی۔ تھا ٹھیک ہے پر اب نہیں تھا۔ اور جب نہیں تھا تو اُس کے متعلق سوچنا کیا؟

وہ سوچوں کا سلسلہ پھر سے ملا دیتی۔ جزیرے پر کبھی رحمت بابا اور کبھی بیرسٹر انکل کے خطوط کے ذریعے مسٹر خان کا اسے طرح طرح سے پریشان کرنا۔ پھر اچانک جائیداد کا واپس مل جانا۔ وطن واپسی اور آج اپنی کوٹھی میں منتقلی ___ اُسے سب خواب لگ رہا تھا۔

وہ خوش تھی، مطمئن تھی۔ کہ ایسے حالات میں جانے کہاں سے اُسے اپنا مسٹر خان کے آفس

جانا یاد آ گیا۔ ماحول کو تصور کرتے ہی وہ لرز سی گئی۔ خوش قسمتی تھی اُس کی نکل بھاگی تھی وہاں سے۔

"میری تجویز آپ کے گوش گزار کی بیرسٹر عرفان نے یا نہیں؟" اُسے اچانک مسٹر خان کی بات یاد آ گئی۔

"بیٹے مسٹر خان کا تقاضا اب بھی اپنی جگہ ہے۔ کل ہی اُس نے پھر یاد دہانی کرائی ہے"۔ انکل نے اس کی بات کی تصدیق کی تھی۔

اُس کا دل یکبارگی دھڑکا۔ اطمینان کافور ہو گیا۔

بار بار کہلوانے پر بھی وہ اپنی بات پر اڑا تھا، کیا وہ زبردستی کر سکتا تھا؟ انکل بھی کچھ بے بس سے لگ رہے تھے، کیا ہتھیار ڈال دیئے تھے اس کی ہٹ دھرمی کے آگے؟

"اُس کے جزیرے پر اُس کی اجازت کے بغیر کوئی قدم بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ کہاں کہ آ کر مشعل کو اٹھا لے جائے" پچھلے دنوں پھپھو کی بتائی اُسے شیر شاہ کی بات یاد آ گئی۔

کتنا بولڈ تھا۔ مضبوط، نڈر ـــ مگر وہ تو اس کا گھر چھوڑ کر چلی آئی تھی۔ اور چھوڑ کر آتی بھی کیوں نہیں ـــ اس کا روّیہ جو اتنا روکھا تھا اُس کے ساتھ۔

اس کے بعد چھوٹے منہ ایسے پوچھا تک نہیں تھا۔ یہیں کہیں رہتا تھا آس پاس کے شہروں میں، چاہتا تو اُسے آ کر مل سکتا تھا۔ اُسے اپنی پراپرٹی اپنی کوٹھی سب واپس مل گئے تھے مبارکباد کے دو لفظ بھیج سکتا تھا ـــ مگر ـــ

اُس نے پھر سر جھٹک دیا۔ آج نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کا خیال آیا تھا۔

اور وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ اس کا گھر چھوڑنے کے بعد جو وہ اُس کے لئے دکھی ہوئی تھی اُس کی یاد میں تڑپی تھی۔ تب بھی اس کا بیگانوں جیسا روّیہ یاد کر کے اُس نے عزم کیا تھا اسے یاد نہیں کرے گی، بھول جائے گی اُسے۔

پچھلے چند دن وہ کافی حد تک بہل گئی تھی۔ وطن واپسی، انکل و آنٹی کی شفقت، پراپرٹی کی واپسی کی خوشی، پرائیویٹ طور پر بی اے کی تیاری کے لئے بھاگ دوڑ ـــ ان سب میں مصروف وہ اس کی یادوں کو محو کرنے میں جیسے کامیاب ہو گئی تھی۔ کامیاب ہو گئی تھی؟ یا مصروف تھی بہت زیادہ؟

اور آج ـــ جب مصروفیات کم پڑی تھیں، سکون کے لمحے میسر آئے تھے ـــ تو تو ـــ پھر سے اس کی صورت، اس کی باتیں سر ابھارنے لگی تھیں۔

پھر بھی ـــ اس نے خیال بدلا ـــ کہ وہ بدل گیا تھا۔

اور جب وہ بدل گیا تھا تو وہ کیوں اُسے یاد کرنے کی پابند رہتی؟

اُس نے مشعل سے دوستی کی تھی، گپ شپ کرتا تھا۔ بس اتنا ہی تھا شاید۔

مگر نہیں ـــ اُسے پیار بھی کیا تھا اور پیار تو اُسے کیا جاتا ہے جسے چاہا جاتا ہے۔ اُس نے کہا بھی تھا وہ اُسے چاہتا تھا بہت زیادہ بے انداز ـــ پھر ـــ

کیا یہ سب ویسے ہی کہا جاتا ہے؟ تب تو بڑا سیریس لگ رہا تھا۔

کیا پوز کر رہا تھا؟ اور اچانک ایک کوندا سا لپکا اس کے ذہن میں۔ فلرٹ کر رہا تھا اس کے ساتھ ـــ اُس نے سنا تھا فلرٹ اسی طرح کرتے ہیں۔ پورا یقین دلا کر اچانک بدل جاتے ہیں۔ صورت بھی نہیں دکھاتے۔

اور ـــ اُسے غصہ آ گیا۔ فلرٹ کرنے کو کیا وہ ہی ملی تھی اُسے؟

اور ایک بار اور اس نے سر جھٹکا۔ آئندہ ایسے شخص کے متعلق سوچنا بھی اس کی توہین تھی۔

وہ آنے والے ڈنر کے متعلق سوچنے لگی۔ اپنی تمام دوستوں کے علاوہ وہ پاپا کے بھی تمام فرینڈز کو انوائیٹ کرے گی۔ سب نے اس کی املاک کی واپسی کا سنتے ہی باری باری اُسے مبارکباد کے پیغام دیئے تھے۔ کسی نے تار سے۔ کسی نے فون کے ذریعے تو کئی نے خود آ کر ـــ

اور ـــــ اُس جگمگاتی رات کی رونقوں کے متعلق سوچتے سوچتے آخر کار اُسے نیند آ ہی گئی۔

موسم خاصا بدل گیا تھا، دن میں تمازت کم اور شامیں خوشگوار ہو چلی تھیں۔

کوٹھی کے پچھواڑے خوبصورت بیضوی شکل کے تالاب کے اردگرد مخملیں لان پر چار چار کی میزیں دُور دُور تک لگی تھیں۔ تالاب کے بیچوں بیچ بڑے بڑے ان گنت غبارے سجے تھے۔ اور آس پاس، دور نزدیک ـــــ اونچے گھنے درخت اور چھوٹے بڑے پھولدار پودے یکساں طور پر جلتے بجھتے قمقموں سے آراستہ تھے۔

کوٹھی کا بیرونی گیٹ، پورچ تک آتے دورویہ سفیدے اور تمام کوٹھی بقعۂ نور بنے تھے۔

روح پرور موسیقی تھی، لہراتے رنگین آنچل تھے، رنگوں کا نور تھا۔

بیرسٹر انکل اور پاپا کے ایک دیرینہ دوست گیٹ پر کھڑے مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ جبکہ کوٹھی کے آخری سرے پر پچھواڑے جانے والے راستے پر مشعل اپنی دوست شاہینہ کے ساتھ کھڑی مہمانوں کو ریسیو اور راستے کی نشاندہی کر رہی تھی۔

قیمتی سفید ریشم کے کپڑوں میں ملبوس، سچے موتیوں کا نایاب زیور پہنے، بڑا سا دوپٹہ لئے ـــــ اپنے تمام تر حسن اور معصومیت کے ساتھ وہ آسمان سے بھٹکی کوئی حور لگ رہی تھی۔

"شاہینہ میں تھک گئی ہوں"۔ اونچی ہیل میں کھڑے کھڑے وہ واقعی تھک گئی تھی۔

شاہینہ اُسے توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا دی۔

"خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے"۔

''ایسی بات نہیں میں اونچی ہیل پہننے کی عادی نہیں ہوں نا اس لئے''۔

''اچھا جاؤ بابا دم لے لو تھوڑی دیر۔ میں یہیں کھڑی ہوں''۔

''SO SWEET OF YOU''۔ مشعل تشکر آمیز لہجے میں کہتی وہاں سے چل دی۔

تھوڑی دیر ایک طرف ایک کرسی پر بیٹھی۔ مہمانوں کی آمد کا تانتا قدرے کم ہونے لگا تھا۔ لوگ ٹولیوں کی شکل میں گپ شپ میں مصروف تھے۔ معمر لوگ کرسیوں پر بیٹھے پرانے اور نئے زمانے کا آپس میں موازنہ کر رہے تھے۔ ادھیڑ عمر ملک کی سیاست پر بحث کر رہے تھے۔ نوجوان طبقہ غمِ فردا سے لاتعلق بے فکری سے بات بے بات قہقہے بکھیر رہا تھا۔

سفید یونیفارم میں ملبوس متعدد مستعد بیرے کولڈ ڈرنکس سے مہمانوں کی تواضع کر رہے تھے، اُن کی مدد کر رہے تھے، ان کا ہر حکم بجا لا رہے تھے۔

وہ دم لے چکی تھی۔ اٹھنے کو تھی کہ پھپھو آن دھمکی۔

''اے کہاں کہاں تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں''۔ وہ بھی سانسوں کے درمیان بولیں۔

اور ــــ مشعل ان کی سج دھج دیکھ کر اپنی ہنسی نہ روک سکی۔

سبز ریشمی چمکتے سوٹ پر سبز ہی گوٹہ لگا دوپٹہ لئے۔ وہ معمول سے کہیں بڑھ کر سرمہ ڈالے تھیں دونوں آنکھوں میں۔ ہونٹ دنداسے سے لال کئے تھیں اور سر میں تیل بھی کچھ زیادہ ہی ڈال گئی تھیں۔ اور تو اور آج تو اونچی ایڑی کی سینڈل بھی پہنے تھیں۔

''کیوں پھپھو''۔

''اے کالا ٹیکہ لگانا تھا تجھے''۔ وہ اپنی دائیں آنکھ سے انگلی پر سرمہ لیتے ہوئے بولیں۔ ''کہیں نگوڑی نظر نہ لگ جائے کسی کی۔

اور ــــ مشعل بھاگی شاہینہ کی طرف۔

''اے بڑی شریر ہے یہ۔ اپنا پرایا بھلا جانے کب سمجھے گی''۔ پھپھو بڑبڑاتی رہ گئیں۔

مہمان تقریباً سبھی آ چکے تھے۔ کھانا لگ جانے کا اعلان ہوا تو سبھی میزوں کی طرف بڑھے۔

ایک طرف ایک بڑی میز خاص طور سے مشعل اور اس کی چیدہ چیدہ دوستوں کے لئے لگائی گئی تھی۔ یہاں بوفے کا بندوبست تھا سوائے پھپھو کے جو کھانا پلیٹ میں نکالے آرام سے ایک کرسی پر رونق افروز تھیں۔

اپنی سب دوستوں کی دیکھ بھال کے بعد مشعل نے بھی پلیٹ میں تھوڑے سے چاول اور روسٹ کا پیس لیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا قدرے فاصلے پر شاہینہ کھڑی کھانے میں مصروف تھی۔ مشعل بھی وہیں چلی آئی۔

خوشگوار باتوں میں مصروف دونوں کھانا کھا رہی تھیں۔

''چاول بڑے مزیدار پکے ہیں''۔ شاہینہ مزے لیتے ہوئے بولی۔

''جا کر اور لے لو''۔ مشعل نے اُس کی پلیٹ خالی ہوتے دیکھ کر کہا۔

''ہاں لینے ہی پڑیں گے''۔ شاہینہ میز کی طرف بڑھی۔

مشعل نے سامنے نگاہ کی۔ وسیع لان میں دُور دُور تک لگی میزوں پر بیٹھے مہمان پُرتکلف کھانا کھانے میں مشغول تھے۔

بیرے آس پاس منڈلا رہے تھے۔ ہر مہمان کی ضرورت حتی الوسع پورا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

موسیقی کی روح پرور دھنیں تھیں، پرفیوم اور سگرٹوں کی مہک تھی، قہقہے تھے زندگی تھی ــــ وہ مسحور سی آس پاس دیکھ رہی تھی۔

''CONGRATULATIONS''۔ کسی نے پاس سے کہا۔

اس کی محویت ٹوٹی ـــ دیکھا ـــ شیر شاہ تھا۔

سیاہ قیمتی سوٹ میں ملبوس، اونچا قد، چوڑے شانے، پرکشش نقوش ـــ اپالوں کا مجسمہ جیسے آ ایستادہ ہوا تھا۔

وہ کیسے آ گیا تھا یہاں؟

پل بھر کو وہ بہک سی گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے سنبھل گئی۔ اُس نے اُس کے ساتھ فلرٹ کیا تھا، اس کی توہین کی تھی۔

''آپ ـــ کیوں آئے ہیں''۔

''آیا نہیں بلایا گیا ہوں''۔ وہ اطمینان سے بولا۔

اُس کی دلنشین آنکھوں میں چمک تھی، پرکشش لب متبسم تھے۔

کچھ عرصہ قبل کی ناراضگی کا، خفگی کا شائبہ تک نہ تھا۔ بھول بھال گیا تھا جیسے سب۔

ایک ثانیہ کو وہ چپ سی رہ گئی۔

یقیناً بیرسٹر انکل نے مدعو کیا تھا۔ جان پہچان تھی شاید اُس سے۔

''مگر ـــ میں نے نہیں بلایا''۔ وہ سامنے دیکھنے لگی۔

''مجھے جو کارڈ ملا تھا۔ اُس پر مدعو کئے جانے والی کی جگہ میرا اور بلانے والے کی جگہ تمہارا ہی نام تھا''۔ وہ بات چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔

اس کی آنکھیں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ لبوں پر کا تبسم گہرا ہو چلا تھا۔

''بیرسٹر انکل نے بلایا ہوگا''۔

''ایک ہی بات ہے''۔

''ایک نہیں ہے۔ میں نہیں جانتی آپ کون ہیں''۔ وہ اب بھی سامنے دیکھ رہی تھی۔

وہ ہنس دیا ـــ دلآویز ہنسی۔

''میں تو جانتا ہوں تم کون ہو''۔

''فلرٹ آدمی ہر لڑکی کو جانتا ہے''۔ وہ تلخی سے بولی۔

''میں؟ فلرٹ ـــ توبہ توبہ''۔

مگر ـــ اس کے لب و لہجے پر مشعل کو ہنسی نہیں آئی۔ وہ اب بھی ماتھے پر کئی بل لئے سامنے نظریں جمائے تھی۔

''آپ چلے جائیں یہاں سے''۔

''کیوں؟ میں بلایا گیا ہوں یہاں۔ مہمان ہوں...''۔

اور مشعل کو یاد آیا وہ بھی تو مہمان تھی اُس کے یہاں۔

''میں زیادہ بحث میں پڑنا نہیں چاہتی مگر...''۔ اُس نے بہت دن پہلے شیر شاہ ہی کی بات دہرانا چاہی۔

''اتنی خوبصورت لڑکی بحث کرتی اچھی نہیں لگتی''۔ وہ اُسے سر سے لے کر پاؤں تک توصیفی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''آپ ـــ فضول باتیں مت کریں''۔ اُس کی تعریف اُسے اس کی دل لگی لگی۔

''خدا کی قسم تم بہت خوبصورت ہو''۔

وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ آج کیسی باتیں کر رہا تھا وہ۔ اُس کی کسی بات کا بُرا ابھی نہیں منا رہا تھا۔ بولے چلا جا رہا تھا۔ خوشگوار لہجے میں، خوبصورت انداز میں۔

وہ گھبرا گئی۔ وہ پھر نہ نرم پڑ جائے۔ اُس کی دلفریب باتوں میں آ کر، اس کی مسحور کن شخصیت سے موم ہو کر۔

''آپ چلے کیوں نہیں جاتے''۔ قریبی درخت سے ٹک کر وہ جیسے تھک کر بولی۔

''چلا جاؤں؟''

"ہاں"۔

"سوچ لو"۔

"جائیں نا"۔ اندرونی کشمکش سے تنگ آ کر اس نے اُسے ہاتھ سے پرے دھکیل دیا۔

اور ـــــ خوبصورتی سے ہنستا وہ وہاں سے چل دیا۔

"کون تھا کون تھا؟" وہ سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ شاہینہ آدھمکی۔

"تم کہاں تھی اتنی دیر؟" وہ ہی جلدی لوٹتی تو شاید شیر شاہ نہ آتا وہاں۔

"بڑی جلدی خیال آیا۔ جناب میں چاول لے کر پلٹی تو دیکھا کہ یہ صاحب تمہارے پاس کھڑے تھے۔ میں نے مخل ہونا نہ چاہا۔ اچھا بتاؤ کون تھا؟" وہ پھر اصرار کرنے لگی۔

"میری پھپھو جس جزیرے پر رہتی تھیں یہ اُس جزیرے کا مالک ہے"۔ مشعل نے بڑی مشکل سے بات بتائی۔

"مگر مجھے تو وہ تمہارا بوس لگ رہا تھا"۔

"میں ـــــ میرا کوئی بوس نہیں ہو سکتا"۔

"مگر یہ والا ہو سکتا ہے۔ اسے تو میں ریسیو کرتے ہوئے بھی گڑبڑا گئی تھی۔ تم ستانے چلی گئی تھیں تو یہ آیا تھا۔ اونچا لمبا، اتنا پُرکشش ـــــ قسم سے میں تو راستہ دکھانا ہی بھول گئی تھی"۔

اور ـــــ بڑی دیر بعد مشعل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"بہت امپ س لگ رہی ہو"۔

"میں کیا ـــــ میز پر جتنی لڑکیاں ہیں سب مَری جا رہی تھیں"۔

"اوہ"۔ تو اُس کی تمام فرینڈز دیکھ رہی تھیں۔ آؤ کھانا کھائیں"۔

مشعل نے بات بدلنا چاہی۔ دونوں میز پر آ کر کھانا کھانے لگیں۔

پھر ـــــ ایک ایک کر کے تمام مہمان رخصت ہو گئے۔

تھکی تھکائی وہ اور پھپھو بھی اندر آ گئیں۔

"میں چلتی ہوں ذرا باورچی خانے"۔ پھپھو اُسے ہال میں سیڑھیوں کے پاس چھوڑ کر آگے بڑھ گئیں۔

"اس وقت؟"

"ارے چاول کھاؤں گی ذرا۔ گوشت بھی ٹھیک سے نہیں کھایا۔ تمہاری سہیلیوں کے آگے ڈھٹ کر تھوڑی کھا سکتی تھی کھانا"۔

"اچھا اچھا"۔ مشعل مسکراتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

بیڈروم میں آ کر اُس نے جلدی جلدی رات کے کپڑے بدلے اور بستر پر پڑ رہی۔

مگر ـــــ باوجود سارے دن کے تھکاوٹ کے نیند اُس سے کوسوں دُور چلی گئی تھی۔

رہ رہ کر نظروں میں شیر شاہ کی صورت، کانوں میں اُس کی باتیں گونج رہی تھیں۔

وہ اس کی منزل نہیں تھا ـــــ ذہن بار بار مشورہ دیتا، اس کے متعلق سوچنا فضول تھا۔ مگر دل تھا کہ نادان تھا، اُسی کے ہی نام سے دھڑک رہا تھا، مچل رہا تھا۔

جزیرے پر ملتا تھا، گپ شپ کرتا تھا، دل خوش کرتا تھا۔ پھر وطن آیا تو مڑ کر خبر تک نہ لی۔ وہ یہاں آئی تو خیریت تک نہ پوچھی۔

اور ـــــ انکل نے مدعو کر لیا، تو چلا آیا، یہ تک فکر نہ تھی کہ اتنا عرصہ پوچھا تک نہ تھا سامنا کیسے کریگا؟

پھر ـــــ ملا ـــــ ملا بھی اِس لئے کہ مدعو جو اُس کی طرف سے تھا ورنہ چل دیتا ملے بغیر ہی۔

اور ملا بھی تو کیا؟

کیا اُس کی باتوں میں کل کے لئے کوئی اشارہ تھا؟ آنکھوں میں آئندہ کے لئے کوئی پیغام تھا؟ انداز میں آنے والے دنوں کے لئے کوئی وعدہ تھا؟

ہونہہ ___ کچھ بھی تو نہیں تھا۔ بلایا گیا تھا، آ گیا۔ جانے کا وقت ہوا تو چلا گیا۔ آئندہ بھی، کبھی کہیں ملاقات ہو گی تو 'ہیلو ہائے'، کہہ دے گا پھر ___ چل دے گا۔

یہ کوئی منزل تو نہ ہوئی۔ وہ پاگل من کو سمجھانے لگی۔

''ٹن۔ ٹن۔ ٹن۔ ٹن''۔ نیچے ہال میں لگے کلاک نے صبح کے چار بجائے تو وہ چونکی۔ ذہن کے مشورے پر عمل کرنے کے لئے خود کو تیار کرتے کرتے اُسے گھنٹے لگ گئے تھے۔

وہ بستر سے اُٹھ آئی۔ جتنی دیر وہ بستر پر رہے گی یہی سب سوچتی رہے گی۔

باتھ روم جا کر اُس نے وضو کیا۔ پاس ہی پھپھو کے کمرے میں آ گئی۔ وہ اس وقت نماز کی تیاری کیا کرتی تھیں۔ وہ بھی وہیں ان کے ساتھ نماز پڑھ لے گی۔ اور پھر باقی کا وقت ان کی دلچسپ باتوں میں کٹ جائے گا۔

مگر ___ جب دونوں نے نماز پڑھ لی تو پھپھو نے اُسے چلتا کیا۔ وہ سونا چاہتی تھیں رات بہت تھک گئی تھیں۔

وہ بادل نخواستہ پھر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ بستر پر لیٹ کر تھکی آنکھیں موند لیں۔

اور خلاف توقع نیند کی دیوی مہربان ہوئی اور اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

ٹررن۔ ٹررن۔ فون کی گھنٹی سے وہ ہڑبڑا اٹھی۔

''یس ___ مشعل سپیکنگ''۔ اُس کی آواز خمار آلود تھی۔

''لگتا ہے سو رہی تھیں اب تک''۔ مردانہ اجنبی آواز تھی۔

مگر ___ اس کی تمہید مشعل کو اچھی نہ لگی۔

''کون صاحب بول رہے ہیں''۔ سستا سا لہجہ، دبی دبی ہنسی۔

مشعل کو اس کی ہنسی بہت مکروہ لگی ___ کراہت سی آنے لگی اُسے۔

''کوئی کام ہے تو بتاؤ ورنہ بند کرو''۔ وہ سختی سے بولی۔

''کام۔ کام تو آپ کو معلوم ہے۔ انجان کیوں بنتی ہیں''۔ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''کون بول رہے ہو''۔ وہ مشکوک سی پوچھنے لگی۔

''اچھا بابا بتائے دیتے ہیں۔ خان بول رہا ہوں''۔ وہی دبی دبی ہنسی۔

اور ___ مشعل کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔

''ک ___ کیا چاہتے ہیں''۔ وہ بمشکل بولی۔

ہنسی گہری ہو گئی۔

''آپ کو چاہتا ہوں ___ اور کچھ نہیں''۔

اس کا لب و لہجہ اتنا غلیظ تھا۔ آفس میں اُسے ملنے کے بعد سے تو وہ اُس کا مکروہ چہرہ، گندی نظریں اور غلیظ ہنسی تصور بھی کر سکتی تھی۔

''بولیئے نا۔ کیا بیرسٹر عرفان نے ابھی تک میرا پیغام نہیں دیا''۔

اور وہ مزید برداشت نہ کر سکی۔

''بند کرو بکواس''۔ وہ چلائی۔

کہنے کو تو اُس نے کہہ دیا۔ فون بھی بند کر دیا ___ مگر ___

اُس کی سانس تیز چل رہی تھی، بدن میں سنسناہٹ تھی اور رنگ اڑا اڑا سا۔

وہ پچھتائی وہ اُس کے آفس گئی کیوں؟ جزیرے سے آئی تھی بالکل خاموش تھا۔ خواہ مخواہ جا کر اُسے یاد دلایا سب۔ مگر نہیں ___ شاید وہ انکل کے یہاں مقیم تھی اور وہ وہاں بات نہ کرنا چاہتا تھا۔ یاد دہانی کرائی تھی انکل کو۔

اس نے گھڑی دیکھی نو بج رہے تھے۔ اپنے آپ کو سنبھالتی وہ باتھ روم گئی۔ کپڑے بدل کر تیار ہوئی۔ بالوں میں برش کر رہی تھی کہ پھر فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ آگے بڑھ کر اُس نے ریسیور

کان سے لگالیا۔

''مشعل بول رہی ہوں''۔ وہ ماؤتھ پیس میں بولی۔

''میں خان بول رہا ہوں''۔ وہی دبی دبی مکروہ ہنسی۔

اور ___ مشعل نے کوئی جواب دیئے بنا ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ اُس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ وہ تو جیسے پیچھے ہی پڑ گیا تھا۔

نڈھال سے قدم سنبھالتی وہ نیچے ڈائننگ روم میں آ گئی۔

پھپھو اُسی کی منتظر بیٹھی تھیں۔ دیر سے سہی وہ ناشتہ مشعل کے ساتھ ہی کیا کرتی تھیں۔

''آؤ بیٹا۔ سوئیں کچھ کہ نہیں؟''

''ہاں اس وقت تو سوئی ہوں۔ مگر رات بالکل نیند نہیں آئی''۔

کُرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ کچھ بجھی بجھی سی بولی۔

''کیا بات ہے۔ کس کا فون تھا؟''۔ اُنہوں نے ابھی کچھ دیر قبل ہال میں سے گزرتے ہوئے اس کے کمرے میں گھنٹی کی آواز سُنی تھی۔

''مسٹر خان کا''۔ وہ آہستہ سے بولی۔

''کیا؟''۔ پھپھو اچھل کر رہ گئیں۔

''ہاں پھپھو۔ صبح سے یہ دوسرا فون تھا''۔

''کیا کہتا تھا''۔ انہوں نے پلیٹ کی طرف بڑھا ہاتھ روک لیا۔

''ابھی تک باز نہیں آیا اپنے ارادوں سے''۔

کیا مطلب؟ یعنی تمہارے بارے میں ...''۔

''ہاں''۔

''بیٹے کیا کریں اس آدمی کا۔ اب تو کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا ہی چاہیئے اِس کا''۔

''پھپھو میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا''۔

''میں بیرسٹر صاحب سے بات کروں گی کہ سختی سے اسے منع کر دیں ورنہ اچھا نہیں ہوگا اس کے حق میں''۔

پتہ نہیں کیوں انکل بھی کچھ دبے سے لگتے ہیں اُس سے...''۔

''ظالم اور بدکردار لوگوں سے شریف لوگ دبتے ہی ہیں بیٹا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہم پر اس معاملے میں زبردستی کرے''۔

مشعل آہستہ آہستہ ناشتہ کر رہی تھی۔ سوچوں میں کھوئی بار بار مسٹر خان کے آفس جانے پر پچھتا رہی تھی۔ پہلے تو جو کہتا تھا اِن ڈائریکٹ کہتا تھا۔ انکل سے کہلواتا تھا یا پھر رحمت بابا سے۔ مگر وہ مل کر آئی تھی تو براہ راست بات کرنے لگا تھا۔ وہ دل کی بات پھپھو سے بھی کہتے ہوئے گھبراتی تھی۔ ظاہر ہے اس قدر اوباش شخص کے پاس اکیلے جانے پر وہ بھی برہم ہوتیں۔

''میں شیر شاہ کو بتاتی ہوں سب۔ بہت ہو چکا۔ اس کا اختتام ہونا چاہیے اب''۔

رات ڈنر پر وہ پھپھو سے ملا تھا۔ دیر تک باتیں بھی کی تھیں۔ مگر اِس موضوع پر بات نہ ہو سکی تھی۔ اور کچھ یہ باتیں ذرا مدھم بھی پڑ گئی تھیں۔

''نہیں پھپھو اُس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں''۔

''بیٹا اب تم اُس کی طرف سے دل صاف کرلو۔ سب کچھ ہمارے پاس مگر گھر میں مرد نہیں ہے جو باہر والوں کا توڑ بن سکے۔ شیر شاہ میرے بچوں کی طرح ہے اور ___ تمہیں بھی ناپسند نہیں کرتا''۔

وہ تلخی سے مسکرادی۔

اس کی پسند ___ صرف چکنی چپڑی باتوں تک ہی محدود تھی۔ وہ بھی جب کبھی سرِ راہ ملنے کا اتفاق ہو جاتا تو ___ ورنہ اُسے یاد بھی نہیں ہوتا تھا کہ مشعل تھی کون؟

وہ اچھی طرح جان چکی تھی اُسے۔ مگر خاموش رہی۔ کہ اس وقت وہ تھوڑی دیر قبل کے ٹیلیفونوں سے بہت پریشان تھی۔

"تم پریشان نہ ہو کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔ پھر فون آیا تو مجھے پکڑا دینا دیکھنا کیسی خبر لیتی ہوں کمینے کی"۔

اور ـــ نہ چاہتے ہوئے بھی مشعل کو بلند بانگ دعوے کرنے والی پھپھو پر ہنسی آ گئی۔

"اچھا پھپھو"۔ وہ دودھ کا خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

پھپھو نے بھی ناشتہ کر لیا تھا۔ کرسی پیچھے کھسکاتے ہوئے اٹھنے لگیں۔

"میں جاتی ہوں ذرا باورچی خانے۔ کام وام سمجھاتی ہوں خانسامے کو..."۔

"میں بھی کالج جا رہی ہوں۔ پرنسپل سے بھی ملنا تھا ـــ کلرک سے بھی بات کرنی تھی"۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں وہ کاغذ رکھے ہیں میں نے تمہاری الماری میں۔ فوٹو ہو گیا اُن کا"۔ اس کے ایف اے کے نمبر وغیرہ پھپھو نے فوٹو سٹیٹ کروائے تھے۔

"شکریہ پھپھو"۔ وہ اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

تیار تو تھی ہی۔ جلدی جلدی الماری میں سے کاغذ نکالنے لگی۔

"ٹرن ٹرن..."۔ ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی۔

اس کا دل جیسے حلق میں آ گیا۔ کتنی خوفزدہ تھی وہ اس بدقماش انسان سے۔ خاص طور سے جب سے اس کی شکل دیکھی تھی، اُس کا ماحول دیکھا تھا۔

مگر ضروری تو نہیں کہ اُسی کا فون ہو۔ خود کو سنبھالتی وہ فون تک آ گئی۔

"کون"؟ دل کڑا کر کے اس نے پوچھا۔

"خان"۔

اور ـــ اُسے اپنا رنگ سفید ہوتا صاف محسوس ہوا۔

"کیا چاہتے ہو تم؟" وہ بظاہر دلیر بن گئی۔

"آپ کو دیکھنے کے بعد دل بیقرار ہے..."۔

"شٹ اپ"۔ خوفزدہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس کا گندہ لہجہ، مکروہ ہنسی برداشت نہ کر سکی۔ چلا اٹھی۔

اور ـــ آگے بڑھتے ہوئے اس نے ٹیلیفون ڈسکنکٹ کر دیا۔ نہ کوئی کنکشن رہے گا اور نہ یہ ناپاک آواز سننے کو ملے گی۔

ضروری چیزیں ہینڈ بیگ میں ڈال کر وہ کچن میں پھپھو کے پاس آ گئی۔

"پھپھو میں چلتی ہوں۔ دیر ہو گئی تو پریشان مت ہوئیے گا۔ فرینڈز کے پاس بھی رہوں گی تھوڑی دیر"۔ اُس نے فون کے متعلق نہیں بتایا کہ پھپھو اور بھی فکرمند ہو جائیں گی۔

"جاؤ بیٹا مگر"۔ وہ پاس آ گئیں۔ "رحمت بھیا کو ساتھ لیتی جانا۔ آئندہ اکیلی بالکل مت نکلنا گھر سے"۔ وہ رازداری سے بولیں۔

کتنا ٹھیک کہتی تھیں پھپھو۔ اُسے آج احساس ہوا۔

"اچھا پھپھو آپ فکر مت کریں"۔ جب کہ وہ خود فکروں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

پرنسپل سے مل کر، کلرک کے آفس میں اپنے کاغذ جمع کرانے کے بعد۔ وہ کچھ دیر اپنی کلاس فیلوز، دوستوں کے پاس رہی۔ وقت کافی اچھا کٹ گیا۔ پھر ـــ وہ رحمت بابا کے ساتھ واپس گھر آ گئی۔

دوپہر کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پتہ نہیں کیا تھا اُسے اپنے کمرے سے بھی ڈر لگ رہا تھا۔ ٹیلیفون اور پلگ پر نظر ڈالی۔ ڈسکنکٹ تھا اب بھی۔ وقتی طور پر مطمئن ہو کر وہ بستر پر پڑ رہی۔ جسمانی تھکاوٹ ـــ زیادہ ذہنی طور پر تھکی ہوئی تھی۔ جلد ہی نیند نے آ لیا۔

آنکھ کھلی، سامنے کلاک پر نگاہ کی۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ سونے کے بعد وہ بہتر محسوس کر رہی تھی۔ اٹھ کر وہ باتھ روم چل دی۔ ٹھنڈے پانی کا شاور لے کر اس کی طبیعت بشاش ہوگئی۔ ڈریسنگ روم میں کپڑے تبدیل کرتے ہوئے اُس نے بالوں میں برش کیا، کپڑوں پر اپنی مخصوص کلون کی سپرے کی اور کمرے میں آ گئی۔

کنکشن اب بھی آف تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے وہ آگے بڑھی اور پلگ لگا لیا۔ کوئی ضروری کال بھی تو آ سکتی تھی۔ آخر کب تک یوں بند پڑا رہ سکتا تھا فون۔

اپنے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سے چند صفحے ناول اٹھا کر وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ دُور تک پھیلے سرسبز کھیت، بائیں طرف صاف نظر آتا اصطبل ـــ سامنے کی پگڈنڈی ـــ اور بے اختیار اُس کا دل اپنی گھوڑی پر رائیڈنگ کرنے کو چاہا۔ واپس مُڑ کر وہ کتاب رکھنے لگی۔

''ٹررن ـــ ٹررن...'' گھنٹی پر وہ اُچھلی۔

مگر اٹھایا نہیں۔ اسی بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون کو گھورتی رہی ـــ پر ـــ ہو سکتا ہے کسی کا ضروری فون ہو!

ہمت کر کے اُس نے ریسیور اُٹھا لیا۔ چپ چاپ کان سے لگا لیا ـــ بولی کچھ نہیں۔

''ہیلو ـــ مجھے معلوم ہے کان سے لگائے بیٹھی ہیں اور بولتی نہیں ہیں''۔ وہی آواز تھی۔ سارا دن جیسے اُسے ہی فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''دیکھیئے آپ کی سانسوں کی آواز صاف آ رہی ہے...''۔

''بند کردے فون کمینے، لفنگے، بے غیرت انسان۔ آئندہ کوشش کی بات کرنے کی تو اچھا نہیں ہوگا''۔ اُس نے اپنی پوری قوت مجتمع کی۔

دوسری طرف سے صرف دبی دبی ہنسی کی سی آواز آتی رہی۔

مشعل نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ وہ کھڑے کھڑے ہانپ رہی تھی۔ مارے غصے کے

اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی ـــ اور ـــ اور ـــ مارے خوف کے اُس سے کچھ بن نہیں پڑ رہا تھا۔

اُسے بیرسٹر انکل سے بات کرنا چاہئے۔ اب معاملہ حد سے بڑھ گیا تھا۔ انہیں بتائے بغیر چارہ نہ تھا۔

''ٹھک ٹھک ٹھک''۔ دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔

''آ جاؤ''۔

رحمت بابا تھے۔ ہاتھ میں سفید لفافہ لئے تھے۔

''بیٹی کافی دیر سے بیرسٹر صاحب کے یہاں سے آدمی آیا بیٹھا ہے۔ آپ سو رہی تھیں اس لئے میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ کہتا ہے بیگم صاحب نے کئی بار کوشش کی فون کرنے کی مگر خراب ہے شاید ـــ یہ چٹھی لایا ہے...''۔ انہوں نے لفافہ مشعل کی طرف بڑھایا۔

اُس نے لفافہ چاک کیا۔ خط نکالا۔

آنٹی نے کئی بار اُسے فون کیا تھا۔ نہ مل سکا تو یہ خط لکھ دیا تھا کہ اُن لوگوں کو اچانک چند دنوں کیلئے شہر سے باہر جانا پڑ گیا تھا۔ اُسے مطلع کرنا ضروری سمجھتے ہوئے یہ خط لکھ دیا تھا...

خط ایک طرف ڈالتے ہوئے مشعل لپک کر انکل کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

''بیٹا وہ لوگ تو چار بجے نکل چکے ہیں''۔ رحمت بابا ہنوز کھڑے اس کا ارادہ بھانپ کر بولے۔

اور ـــ مشعل نے سر تھام لیا۔ اب کیا ہوگا؟ اپنی پریشانی کسے بتائے گی؟ وہ تو اپنے ہی گھر میں رہتے ہوئے پاگل ہونے کو تھی۔

بابا کمرے سے باہر نکل گئے۔

اور مشعل نے کوئی حل نہ پاتے ہوئے ایک بار پھر ٹیلیفون ڈسکنکٹ کر دیا۔ بے جان سے قدم اٹھاتی وہ باہر لان میں آ گئی۔

موسم بہت خوبصورت ہو رہا تھا۔ وسیع مخملیں لان کی گھاس عمدگی سے تراشی گئی تھی۔ خوبصورتی سے ترتیب دی ہوئی کیاریوں میں اعلیٰ قسم کے گلاب مہک رہے تھے۔ دُور آخری سرے پر موتیے کے جھنڈ کے پاس رکھی کرسیوں میں سے ایک پر پھپھو بیٹھیں، دونوں پاؤں اوپر کئے ہاتھ میں چائے کی پیالی لئے گھونٹ گھونٹ کر کے پی رہی تھیں۔

ہر طرف سکون تھا، اطمینان تھا ___ مگر ___ اُس کے شاید مقدر میں یہ لفظ نہ لکھے تھے۔

وہ آگے بڑھ آئی۔

''آؤ بیٹا۔ بیرسٹر صاحب کا آدمی آیا تھا مگر میں نے سوچا تم سولو پوری طرح پھر بات ہوگی''۔

''بابا نے خط دے دیا۔ آنٹی کا تھا ___ لکھا ہے چند دنوں کے لئے شہر سے باہر جا رہے ہیں''۔

''فون کیوں نہیں کر دیا اتنی دور سے آدمی بھیجا...''۔

''فون میں نے ڈسکنکٹ کر دیا تھا''۔

''کیوں؟''

''ابھی پلگ لگایا تو بھی خان کا فون آ گیا''۔ اُس نے بتا ہی دیا کہ اب چھپانے سے کوئی فائدہ نہ تھا۔

''ہیں''۔ انہوں نے جھٹ سے پاؤں کرسی سے نیچے کر لئے۔

''ہاں پھپھو۔ صبح سے کئی بار آ چکا ہے فون۔ میں آپ کو بتا کر پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی''۔

''اے پریشانی کیسی''۔ اُن کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ ''تم کڑھتی رہو اور میں بے خبر رہوں''۔

''میں نے سوچا تھا بیرسٹر انکل سے بات کروں گی مگر...''۔

''ہاں ہاں یہی ٹھیک ہے''۔ انہوں نے چائے کی پیالی بھی واپس میز پر رکھ دی۔

''مگر وہ تو جا چکے ہیں''۔

''ارے''۔ پاؤں دوبارہ کرسی پر چڑھ گئے۔

''کیا ہوگا پھپھو؟'' اس کے لہجے میں مایوسی تھی، پریشانی تھی، اداسی تھی۔

''کچھ نہیں ہوگا۔ ارے وہ کر بھی کیا سکتا ہے۔ خبیث، کمینہ''۔ ساتھ ہی پیالی اٹھا کر وہ چائے کے بڑے بڑے گھونٹ حلق سے اتارنے لگیں۔

مگر ___ مشعل جانتی تھی پھپھو اوپر سے جتنی دلیر بنتی تھیں اُتنی ہی اندر سے ڈرپوک تھیں۔

''یوں بڑھ بڑھ کر بولے گی جیسے اس سے بہادر کون ہوگا۔ مگر بلی نے 'میاؤں' بھی کیا جھٹ پلنگ کے نیچے گھس جائے گی''۔ اُسے پاپا کی پھپھو سے متعلق کہی بات یاد آ گئی۔

''اس سے تو اچھا تھا ہم انکل کے یہاں ہی رہتے''۔ وہ جیسے خود سے بولی۔

''ارے اپنا گھر، ہوتے ہوئے ہم کہیں اور کیوں رہیں۔ دیکھتی ہوں کیا کرتا ہے خان ___ میں بھی ہاجرہ سراج ہوں...''۔

اور نہ چاہتے ہوئے بھی مشعل کے لب متبسم ہو گئے۔

''اے فضل بیٹا لانا ذرا میرے کمرے سے لڈو''۔ وہ کچھ فاصلے پر مالی سے بات کرتے ملازم سے گویا ہوئیں۔ ''کھیلیں گی ذرا دونوں''۔ انہوں نے مشعل سے کہا۔

اور پھر ___ وہ دونوں دیر تک کھیلتی رہیں۔ وقت کچھ اچھا ہی نکل گیا۔

''تم رات کو میرے کمرے میں سونا۔ اور فون ٹھیک کر دینا۔ میں بات کروں گی اب کے''۔ رات پھپھو ڈنر پر بولیں۔

''اچھا''۔ وہ ہولے سے مسکرا دی۔

اور واقعی پھپھو کے کمرے میں بستر لگوا کر لیٹ رہی پلگ بھی لگا دیا۔ فون بھی آ گیا۔

مگر ___ پھپھو گئیں تو آگے سے کسی بات ہی نہیں کی۔ بند کر دیا فون۔

کو سنے دیتیں پھپھو واپس آگئیں۔ایک بار پھر رنگ ہوئی۔پھپھو گئیں۔پھر کسی نے بات کئے بغیر بند کر دیا اور خان کو انواع واقسام کی گالیاں دیتیں پھپھو آ کر بستر پر لیٹ گئیں۔

پھر ـــــ دونوں سوگئیں۔مگر رات کو بار بار مشعل کی آنکھ کُھل جاتی۔دوسرے کمرے میں، دوسرے بستر میں اُسے ٹھیک سے نیند نہیں آرہی تھی۔دو بجے کے قریب وہ آہستہ قدم چلتی اپنے کمرے میں آگئی۔یہاں وہ بہتر محسوس کرنے لگی۔اور جلد ہی نیند آگئی۔

"ٹررن... ٹررن..." صبح ہی صبح گھنٹی پر وہ ہڑبڑا اٹھی۔ہاتھ بڑھا کر اس نے ریسیور کان سے لگالیا۔

"کون؟" وہ اب بھی تقریباً نیند میں تھی۔

"شیر شاہ"۔

اور ـــــ وہ پوری جاگ اٹھی۔ہوش میں آگئی۔حواس کام کرنے لگے۔

ایک عذاب میں مبتلا تھی وہ۔آگ جل رہی تھی اس کے چاروں طرف شعلے نکلے جارہے تھے اُسے ـــــ مگر ـــــ

ایسا عذاب،ایسی آگ،ایسے شعلے ـــــ جو ـــــ

اندھیرا کئے تھے ہر طرف ، سیاہیاں بکھیرے تھے ہر سُو ، تاریکیاں بسائے تھے چاروں اور ـــــ

اُس کا جسم،اُس کا ذہن،اُس کی روح تک گھٹی جارہی تھی ان میں۔

ہر طرف دھواں تھا،غبار تھا،دھول تھی۔

آندھی تھی،جھکڑ تھے،طوفان تھا۔

اور وہ ـــــ یک وتنہا،اکیلی اِدھر اُدھر ڈول رہی تھی۔

کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا،کوئی راہ دکھانے والا نہیں تھا۔کوئی منزل نہیں تھی۔

اور ـــــ وہ ریسیور کان سے لگائے لگائے رودی۔

"مشعل ـــــ مشعل"۔شیر شاہ کی بے چین سی آواز آئی۔

مگر ـــــ آج تو جیسے سارے بند ٹوٹ گئے تھے۔ضبط کا مزید یارا نہ رہا تھا۔وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

"مشعل کیا ہوا؟ پلیز بتاؤ نا۔کیوں رو رہی ہو؟"

مگر ـــــ جوں جوں شیر شاہ کا اصرار بڑھ رہا تھا توں توں اس کا رونا رفتار پکڑ رہا تھا۔

کافی دیر تک وہ روتی رہی۔اور اُتنی ہی دیر شیر شاہ لائین پر رہا۔

"مشعل پلیز اب تو بتادو۔کیا ہوا ہے؟" ایک بار پھر اُس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں ہوا"۔اس نے فون بند کر دیا۔

کہ وہ اُسے کیوں بتاتی؟ کیا لگتا تھا وہ اس کا؟

اور پھر ـــــ وہ پچھتائی۔وہ روئی کیوں اُس کے آگے۔کون تھا وہ اُس کا؟

اٹھ کر اُس نے منہ ہاتھ دھوئے۔کپڑے بدلے اور نیچے ناشتے کی میز پر آگئی۔

ابھی بیٹھی ہی تھی کہ پھپھو بھی آپہنچیں۔

"کیا بات ہے؟" اُس کی متورم آنکھیں دیکھ کر پھپھو پوچھے بنا نہ رہ سکیں۔"پھر کوئی فون آیا تھا؟"

"ہاں ـــــ شیر شاہ کا تھا"۔

"کیا کہتا تھا؟" پریشانی اچانک چھٹ گئی۔

"پتہ نہیں"۔وہ چھری سے ٹوسٹ پر مکھن لگانے لگی۔

"کیا مطلب؟"

"بات نہیں ہوئی میری"۔

"کیوں؟"

"بس نہیں کی بات میں نے"۔

"اے بتا دیتیں کہ خان نے ناک میں دم کر رکھا ہے..."۔

"یہی تو میں بتانا نہیں چاہتی تھی"۔

کتنی ضدی تھی۔ پھپھو مایوس انداز میں سر ہلاتے ہوئے ناشتے میں مصروف ہو گئیں۔

"باجی آپ کا فون ہے"۔ اچانک رحمت بابا آ نمودار ہوئے۔ عمر میں پھپھو سے چھوٹی سہی۔ رحمت بابا مشعل کے دادا کے وقتوں سے اُنہیں اسی نام سے پکارتے تھے۔

"میرا؟" وہ کچھ حیرانگی سے بولیں۔

"ہاں"۔

مشعل کو شبہ سا ہوا۔ شیر شاہ کا فون تو نہیں تھا۔

پھپھو اٹھ کر ہال کے آخری سرے پر رکھے فون کی طرف چل دیں۔

بات کر کے وہ جلد ہی واپس آ گئیں۔ خوش، خوش، مطمئن سی۔

"شام کو شیر شاہ آ رہا ہے"۔ کرسی پر بیٹھتے ہی وہ مسکراتی ہوئی گویا ہوئیں۔

اتنی نئی بات بھی نہیں تھی۔ پرسوں رات ڈنر پر بھی آیا تھا۔ اور پھر پھپھو سے ملنے وہ کسی بھی وقت آ سکتا تھا۔ کوئی نوٹس لئے بنا وہ نیپکن سے ہاتھ پونچھنے لگی۔

"پھپھو میں کالج جا رہی ہوں۔ شاہینہ سے نوٹس لینے ہیں۔ اسی طرح آہستہ آہستہ سب نوٹس اکٹھے کر کے پھر آرام سے گھر بیٹھ کر امتحان کی تیاری کروں گی"۔

"اچھا بیٹا"۔ وہ اب بھی مسکرا رہی تھیں۔ "اللہ حافظ ہو۔ رحمت بھیا کو ساتھ لینا نہ بھولنا"۔

"نہیں بھولتی"۔ اداس سے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

اور ــــ پھپھو زیرِ لب بڑبڑاتیں، اُس کی سلامتی اس کی خوشیوں کی دعائیں مانگنے لگیں۔

تھکا ماندہ سورج نارنجی کرنیں بکھیرتا دور سرمئی پہاڑ کے پیچھے پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ تا حدِ نظر پھیلی سرسوں کے کھیت سنہری ہو رہے تھے۔ اپنا ہل ایک طرف سنبھالتا دن بھر کا تھکا کسان گھر واپسی کی تیاری کر رہا تھا۔ آسمان پر پرندوں کے غول اپنے آشیانوں کی سمت رواں دواں تھے اور ــــ دور چھوٹے کچے مکانوں میں سے اٹھتا دھواں شام کی پکوان کا پتہ دے رہا تھا۔

وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی محویت سے باہر نظریں جمائے تھی۔

"ٹھک ٹھک ٹھک"۔ اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔

"آ جاؤ"۔ رُخ موڑے بغیر ہی اُس نے کہا۔

رُخ موڑے بغیر ہی اُس نے کہا۔

"گڈ ایوننگ میم"۔

چونک کر وہ اندر دیکھنے لگی۔

ڈارک گرے قیمتی سوٹ میں ملبوس اپنی تمام تر مردانہ وجاہت کے ساتھ شیر شاہ اُس کے سامنے تھا۔

وہ جواب دینا بھی بھول گئی۔

"خفا ہو اب تک"۔ وہ پاس چلا آیا۔

وہ تو کوئی تعلق ہی نہ رکھنا چاہتی تھی کہاں کہ خفگی کرے اُس سے؟ رُخ موڑ کر وہ پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"مانا کہ باہر ہر چیز خوبصورت ہے"۔ ایک سرسری نگاہ کھڑکی سے باہر ڈالتے ہوئے اُس نے مشعل کا ہاتھ تھام لیا۔ "مگر ان کے علاوہ بھی کچھ کام ہیں جو اہم ہیں، اور اس وقت بہت ضروری بھی"۔ دوسرے ہاتھ سے اُس نے ہیروں کی ایک جگمگ جگمگ کرتی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی۔ "یہ میری والدہ مرحومہ کی نشانی ہے، میری ہونے والی بیوی کے لئے"۔ اس کا ہاتھ

اٹھا کر اُس نے ہونٹوں سے لگا لیا۔ ''اس کا خیال رکھنا''۔

اور ___ مشعل نے پہلی بار اس مستحکم، مضبوط، سنگین انسان کی آنکھوں میں بدلیاں سی منڈلاتے دیکھیں۔ اُس کی شدت جذبات سے بھاری ہوتی آواز محسوس کی۔

ماں ___ رشتہ ہی شاید ایسا تھا، مقدس، بے لوث، پاک۔

اور ___ وہ ضرور بہت محسوس کر رہا تھا ایسے موقع پر، اُن کی موجودگی، شفقت کی، مہربانی کی۔

وہ بھی گم سم تھی ___ کچھ کہہ نہ پا رہی تھی۔

اُس نے کیا سوچا تھا؟ یہ کیا ہو رہا تھا؟ وہ ٹھیک تھا یا یہ حقیقت تھی؟

''آؤ نیچے ہال میں چلیں۔ آنٹی انتظار کر رہی ہوں گی'' اُسے کندھوں سے تھامے ہوئے وہ باہر آنے لگا۔

وہ بھی ___ جیسے ہپناٹائز کر دی گئی ہو ساتھ ساتھ چل دی۔ بنا کچھ سوچے سمجھے۔ کہ سوچنے سمجھنے کی قوت ہی سلب ہو گئی تھی گویا۔

سیڑھیاں اُترتے اُترتے اُس کی نظر ہال کے کونے والے صوفے پر پڑی۔ پھپھو وہیں بیٹھی تھیں کچھ فاصلے پر کئی بڑے بڑے رنگین کاغذوں میں لپٹے مٹھائی کے ٹوکرے رکھے تھے شیر شاہ لایا تھا غالباً۔ اور پھپھو کے آگے والی میز پر بڑی سی پلیٹ مٹھائی سے بھری پڑی تھی۔ اس کا بندوبست شاید پھپھو نے کیا تھا۔

''لو بیٹا ___ میٹھا کرو''۔ پھپھو جیسے یہی رسم ادا کرنے منتظر بیٹھی تھیں، ان دونوں کے قریب پہنچتے ہی انہوں نے پلیٹ شیر شاہ کے آگے بڑھائی۔

شیر شاہ نے ایک لڈو اٹھا کر مشعل کے منہ میں دیا، وہ لے چکی تو باقی کا خود منہ میں ڈال لیا۔

''مبارک ہو''۔ پھپھو نے مزید کہا۔

''شکریہ آنٹی''۔ شیر شاہ نے پلیٹ سے ایک اور لڈو لے کر پھپھو کی طرف بڑھایا۔ ''آپ بھی لیں''۔

''بیٹھو بیٹا''۔ پھپھو خوش خوش لڈو کھانے لگیں۔

شیر شاہ بیٹھ گیا ___ مشعل اب بھی گم سم کھڑی تھی۔

''بیٹھو نا''۔ شیر شاہ سے اُسے ہاتھ سے تھامتے ہوئے اپنے قریب ہی صوفے پر بٹھا لیا۔

''آج اگر بھائی صاحب ہوتے کتنے خوش ہوتے''۔ پھپھو نم آنکھیں پونچھتے ہوئے بولیں۔

خوشی کے ساتھ ساتھ اس وقت شیر شاہ بھی اداس تھا۔ ایسے موقعوں پر ماں باپ کی کتنی کمی محسوس ہوتی ہے آج اُس نے محسوس کیا تھا۔

''آپ جو ہیں ہماری پھپھو''۔ شیر شاہ نے پہلی بار آنٹی کو 'پھپھو' کہہ کر پکارا۔

اور پھپھو کی ممتا کو جو پکارا گیا تو وہ کیسے پیچھے رہتیں۔ اٹھ کر پہلے شیر شاہ اور پھر مشعل کو ڈھیر سارا پیار کر لیا۔

''پھپھو صدقے جائے اپنے بچوں کے۔ مہلت دے پروردگار کہ اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھوں۔ پھلتے پھولتے دیکھوں انہیں''۔ وہ بار بار دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھ رہی تھیں۔

مشعل اب بھی چپ چاپ تھی۔ جیسے انہونی بات ہو گئی ہو۔

''پھپھو آپ نے اسے بتایا نہیں تھا۔ یہ تو پریشان ہی ہو گئی ہے''۔ مشعل کا ہاتھ ہولے سے دباتے ہوئے وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔

''اے کاہے کو میرا منہ کھلواتے ہو بیٹا۔ صبح تم نے ہی تو منع کیا تھا کہ مشعل کو مت بتائیں میں خود آ کر بتاؤں گا اُسے''۔

شیر شاہ کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

اور مشعل سمجھ گئی۔ صبح شیر شاہ کا فون ریسیو کرنے کے بعد پھپھو کیوں اتنی خوش اتنی مطمئن تھی۔

''اے بیٹا ہم تو اتنے پریشان تھے۔ کل سارا دن موئے خان کا فون آتا رہا۔ طرح طرح سے ستا رہا تھا میری بچی کو...''۔ پھپھو بتانے لگیں۔

''چلیئے اب تو بات ہی ختم ہوگئی''۔ شیر شاہ بولا۔ ''اب آپ کی بچی کو کوئی نہیں ستائے گا''۔

تبھی ___ چائے آ گئی۔

چائے کے دوران بھی خوشگوار باتیں ہوتی رہیں۔

''پھپھو میں مشعل کو لے جاؤں؟'' چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہی شیر شاہ نے کہا۔

''اے بیٹا کہاں؟'' پھپھو کے کرسی کے اوپر چڑھے دونوں پاؤں فوراً نیچے آ گئے۔ پیالی ہاتھ میں لہرا گئی، چائے کپڑوں پر چھلک گئی۔

اور نہ چاہتے ہوئے بھی شیر شاہ کے ساتھ ساتھ مشعل بھی ہنس پڑی۔

''اپنے گاؤں''۔

''کیوں؟'' اُن کی بدحواسی مزید بڑھ گئی۔

''صرف ڈنر کھائے گی میرے ساتھ پھر واپس لے آؤں گا''۔

ان کے دم میں دم آ گیا۔

''گاؤں کتنی دُور ہے بیٹا یہاں سے؟''

''بس تیس میل''۔

''اے بیٹی رحمت بھیا کو ساتھ لیتی جانا''۔ وہ پھر ہول کھانے لگیں۔

''آج تو رحمت بھیا بالکل ساتھ نہیں جائیں گے''۔ شیر شاہ نے کھلا احتجاج کیا۔

''نہیں بیٹا جگہ بڑی دُور ہے''۔

''اور میں ڈاکو ہوں اس کو اٹھا لے جاؤں گا یہی نا''۔

''نہیں بیٹا یہ تو میرا مطلب نہیں تھا مگر...''۔

پھپھو یہ اب میری ہے۔ اس کی عزت بھی میری ہے۔ آپ فکر مت کریں۔ جلدی واپس آ جائیں گے''۔

''اچھا بیٹا''۔ وہ مری ہوئی آواز میں بولیں۔

اور شیر شاہ ہنوز گم سم مشعل کو ساتھ لئے اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔

وہ خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ لہلہاتے کھیتوں میں شام اُتر آئی تھی، سکوت چھا گیا تھا، شانتی گھر آئی تھی۔

مشعل بھی چپ تھی کہ اب کہنے کو کچھ رہا ہی نہیں تھا۔ گلے شکوے سب جاتے رہے تھے کہ اُسے انگوٹھی پہنا کر اب اُس کے پیار پر شک کرنا بجا نہ تھا ___ مگر ___

پھر بھی ___ کئی باتیں تھیں اُس کے من میں! کئی سوال تھے اُس کے ذہن میں!

جو جواب چاہتے تھے، تفصیل مانگتے تھے ___ پر ___

وہ خاموش تھی، چپ تھی ___ کہ اُس نے اچانک اُسے ایسے بندھن میں باندھ لیا تھا کہ اب اُسے اُس سے باتیں کرتے ہوئے شرم آ رہی تھی، حجاب مانع آ رہا تھا۔

وہ سمٹی سی بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

''صبح روئی کیوں تھیں ہاں''۔ پکی سڑک پر گاڑی ڈالتے ہوئے اُس نے دھیرے سے پوچھا۔

''وہ ___ مسٹر خان بار بار فون پر تنگ کر رہا تھا''۔ رُخ اندر کی طرف کرتے ہوئے اُس نے آہستہ سے کہا۔

"کیا کہہ رہا تھا"۔

"فضول باتیں کر رہا تھا"۔

"فضول تو نہیں کر رہا تھا"۔

"آپ کو کیا معلوم..."۔

"اس لئے کہ وہ میں کر رہا تھا"۔

"وہ ــــ وہ آپ تھے"۔ وہ بے یقینی سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں۔ آواز بدل کر تمہیں تنگ کر رہا تھا"۔

"کیوں؟"

"تم نے کیوں ڈنر والی رات دھکا دے کر چلے جانے کو کہا تھا"۔ وہ خوبصورتی سے ہنس رہا تھا۔

"اوہ ــــ وہ تو ــــ وہ تو..."۔

"وہ تو ــــ وہ تو..."۔ ہنستے ہوئے وہ بھی اُسی کے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"مگر ــــ وہ آپ نہیں تھے۔ مسٹر خان تھا"۔

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ وہ میں نہیں تھا"۔

'اس لئے کہ اس کی آواز، اُس کی مکروہ سی ہنسی ــــ اور ــــ اور میں اُسے مل چکی ہوں"۔ وہ راز جواب تک وہ سب سے چھپائے بیٹھی تھی اُسے بتا دیا۔

"تم مسٹر خان کو مل چکی ہو؟"

"ہاں۔ میں 'نور خان ٹیکسٹائیل ملز' گئی تھی اُس کے پاس"۔

"تم ــــ تم نور خان کے پاس گئی تھیں؟" وہیل پر اُس کی گرفت ڈگمگا گئی۔ "مگر کیوں؟" وہ ہنسی بھول بھال گیا۔

"اپنی پراپرٹی کے پیپرز اُسے دکھانے گئی تھی۔ کہ جو پراپرٹی اس نے پاپا کے دستخط کا سہارا لے کر دھوکہ کر کے سیل کروائی تھی، کیس جیت کر مجھے واپس مل گئی ہے۔ اور یہ کہ اب میرے پاس اتنی رقم ہے کہ میں اُس کے پاس اپنی گروی رکھوائی کوٹھی چھڑوا سکتی ہوں، اُس کی خیرات کا مجھے کوئی شوق نہیں اور..."۔

"HOLD ON - HOLD ON"۔ وہ بیچ میں ہی بول پڑا۔ "تمہاری پراپرٹی سیل کروانے والا نور خان اور تمہاری کوٹھی گروی رکھنے والا مسٹر خان ایک ہی شخص ہے"۔ وہ الجھا الجھا سا بولا۔

اور مشعل ــــ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"نور خان اور مسٹر خان میں فرق ہی کیا ہے"۔

شیر شاہ نے گہری سانس لی۔ چند لمحے کچھ سوچتا رہا اور پھر ــــ دھیرے سے مسکرا دیا۔

"تم نے پہلے کبھی ذکر نہیں کیا"۔

"کس بات کا"۔

"یہی کہ نور خان اور مسٹر خان ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں"۔

"دو تو نہیں ہیں"۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر ــــ تم تو تمہاری کوٹھی گروی رکھنے والے کو ہی ڈانٹتی ڈپٹتی رہتی تھیں اکثر"۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"آپ کو ــــ غصہ نہیں آیا اُس پر"۔ وہ معصومیت سے بولی۔

"ضرور آیا ہے۔ مگر اُس سے زیادہ تم پر آ رہا ہے"۔

"کیوں؟"

"میری برتھ ڈے پر تم اکڑ نہ دکھاتیں تو اب تک شادی ہو چکی ہوتی ہماری۔ ان سب

باتوں کی نوبت ہی نہ آتی''۔

اب تک جو انگوٹھی پہنانے کے بعد سے وہ دلیری ہی اس کا سامنا کر رہی تھی اُس کی براہ راست بات پر رفو چکر ہو گیا سب۔ اچانک ہی شرم آنے لگی اُسے۔ یکدم ہی چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

''ک ___ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ''۔ وہ بمشکل بولی۔

اور ___ اُس کا انداز اُسے بے خود کر گیا۔ ہاتھ بڑھا کر اُس نے اس کا سر اپنے پہلو سے لگا لیا۔

''میں نے تو اُسی دن سوچا تھا تمہیں پروپوز کر دوں گا۔ مگر تم نے ___ بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا''۔

''آپ نے بھی تو خود کو چھپایا ہوا تھا''۔ اُس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''اتنا زیادہ بھی نہیں چھپایا تھا۔ برتھ ڈے کارڈ پر میں نے اپنا نام صاف لکھا تھا۔ اس کے علاوہ بھی تمہیں مختلف موقوں پر HINTS ملتی رہی تھیں مگر''۔ اُس نے دھیرے سے اپنے ہونٹوں سے اس کا ماتھا چھوا۔ ''کیا کیا جائے کہ تم بہت چھوٹی ہو''۔ وہ اب بھی اُسے بازو کے حلقے میں لئے آہستہ آہستہ ڈرائیو کر رہا تھا۔

''آپ صاف بتا دیتے کہ آپ مالک ہے جزیرے کے''۔

''اور تم نے یوں دھتکار دیا جیسے جزیرے کا نہیں کسی کوڑے کے ڈھیر کا مالک تھا میں''۔ وہ دھیرے سے ہنستے ہوئے بولا۔

''پہلی پہلی بار جب میں آپ کے یہاں آئی تھی تو آپ کے ملازم نے بھی کہا تھا۔ ''صاحب نے یاد کیا ہے آپ کو''۔ اس نے 'صاحب' پر زور دے کر کہا۔ ''میں یہی سمجھی کہ آپ الگ اور مالک الگ ہیں۔ پھر برتھ ڈے والی شام کو آپ ہی کے ملازم نے کہا 'مالک' سامنے

تشریف رکھتے ہیں...''۔

''صاحب کہنا محض اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔ اور نہ ہی مالک کو 'صاحب' کہنے والے کو جرمانہ کیا جا سکتا ہے''۔

''آئی ایم سوری''۔ وہ آہستہ سے بولی۔ ''میں نے بھی اُسی ہی دن سوچا تھا آپ سے معافی مانگوں گی، مناؤں گی آپ کو مگر...''۔

وہ ہولے سے ہنس دیا۔

''اب منالو''۔

''اب...''۔ وہ اچانک سٹپٹا گئی۔

''ہاں''۔

''ک... کیسے... میں کیسے...''۔

اور وہ پھر ہنس دیا۔

''چلو تم ترکیب سوچو۔ میں وہ بات سوچتا ہوں''۔ اُس کے گرد لپیٹا بازو آہستہ سے نکالتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھوں سے سٹیرنگ تھام لیا۔

''کون سی بات؟''

''پہلے تم مجھے مناؤ۔ اُس کے بعد بات بتاؤں گا''۔ وہ سڑک پر نظریں جمائے جیسے کسی سوچ میں مگن تھا۔

''اچھا''۔ وہ جیسے کوشش کر کے ہمت اکٹھا کرنے لگی۔ رُخ شیر شاہ کی طرف کیا۔ اُس کی آنکھوں پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ''مان جائیں پلیز!'' وہ بمشکل بولی۔

اور ___ اُس کا معصومانہ انداز شیر شاہ کو بے خود کر گیا۔ اُس کا سیٹ پر رکھا ہاتھ اٹھا کر اُس نے ہونٹوں سے لگا لیا۔

"میں خان ہوں"۔ وہ دھیرے سے گویا ہوا "تم جسے مسٹر خان کہتی ہو وہ میں ہی ہوں"۔
ابھی ہی مشعل کو توجہ دیئے بنا وہ بتانے لگا ۔مگر نور خان نہیں۔ شیر شاہ خان۔ نور خان وہ ہے جس نے ذوالفقار انکل سے دھوکہ کیا اور پراپرٹی سیل کروائی۔ مسٹر خان یا شیر شاہ خان وہ ہے جس کے پاس انکل نے اپنی کوٹھی گروی رکھوائی۔

ذوالفقار انکل کی اور میرے بابا کی جان پہچان بہت پرانی تھی، کالج کے وقتوں کی۔ چند سال قبل لندن میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ میں بھی ساتھ تھا۔

"یار یہ میرا وہی بیٹا ہے جس سے میں تمہاری بیٹی کی شادی کا کہا کرتا تھا"۔ بابا نے انکل سے ان الفاظ میں میرا تعارف کرایا۔

انکل کچھ سٹپٹائے سے نظر آنے لگے۔

"یاد ہے دوستوں میں بیٹھ کر میں کہا کرتا تھا شادی کے بعد میرا بیٹا ہوگا اور تمہاری بیٹی۔ میں بیاہ کرلاؤں گا تمہاری بیٹی کو اپنے بیٹے کے لئے"۔ بابا نے مزید کہا۔

انکل اب بھی چپ تھے۔

"یار بتا سچ تیری بیٹی تو نہیں؟" بابا کو شبہ گزرا۔

"ہاں ہے"۔ انکل مسکرائے۔ "مگر صرف بارہ تیرہ سال کی"۔ انکل نے یوں کہا جیسے بیٹی ہونے کے باوجود انہوں نے مات نہیں کھائی تھی۔ ان کی بیٹی بارہ تیرہ سال کی بچی تھی میں انتیس تیس سال کا بھرپور جوان، کوئی نسبت نہ تھی جیسے۔

"لاؤ ہاتھ ملاؤ"۔ بابا نے انکل سے ہاتھ ملایا۔ "کوئی فرق نہیں پڑتا بڑی ہو جائے گی"۔ بابا نے جیسے کھڑے کھڑے فیصلہ کرلیا۔

انکل یوں ہی سب مذاق سمجھ کر مسکراتے رہے۔

"یہ بتاؤ شکل تو تم پر گئی ہے نا"۔ بابا کا اشارہ ان کے صحت مند چہرے اور چمکتی نیلی

آنکھوں کی طرف تھا۔

"ہاں- میری بیٹی جو ہوئی"۔ انکل کے لہجے میں ایک باپ ہونے کا فخر نمایاں تھا۔

"بس پھر آ رہا ہوں یہاں سے فارغ ہوتے ہی"۔

تب نہ میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی اس بات کو کوئی اہمیت دی تھی۔ عرصہ بعد دوستوں کی ملاقات اور آپس میں گپ شپ سمجھ کر بھول بھال گیا تھا۔

اگلے ماہ ہم لوگ واپس آگئے ۔ پتہ چلا بابا کا ارادہ پکا تھا، بات اُن کے دل میں گھر کر گئی تھی۔

میں نے مہمل سا خیال سمجھ کر ٹالنا چاہا۔ میں مجبور تھا۔ ایک بارہ سالہ بچی کے لئے اتنا پہلے سے سوچنا سراسر حماقت لگی مگر بابا مصر تھے۔ بولے "ایسا ہی ہوتا ہے۔ چھوٹی ہے تو کیا ہوا ___ بات پکی کرلوں گا، انتظار کرلیں گے"۔

میں نے ٹالنا چاہا مگر ___ مجھے ٹال گئے۔

"تم چپ رہو بڑوں کی بات میں نہیں بولتے ۔ میں جانتا ہوں اس خاندان کو، خوبصورتی کی مہر لگی ہے ان پہ"۔ بابا خوبصورتی کے شیدائی تھے۔ "اور پھر پشتوں سے شریف مانے جاتے ہیں۔ اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں"۔

میں خاموش رہا۔

مگر ___ ایک روز اچانک بابا کا ہارٹ فیل ہو گیا۔

اور تمام خیال تمام ارادے دل میں ہی لے کر چل دیئے۔

ان کی وفات پر ذوالفقار انکل ہمارے گاؤں آئے تھے۔ مجھے ملتے رہنے کی تاکید کی تھی۔ ایک دم ہی مجھ پر بہت ساری ذمہ داری آ پڑی تھی۔ زیادہ تو نہیں بس یک بار حاضر ہوا تھا۔ مگر شاید ان ایک آدھ ملاقاتوں میں اُن کا مجھ پر اعتماد بن گیا تھا۔ نور خان نے دھوکہ دیا تو کوٹھی

میرے پاس گروی رکھنے کی وصیت کر گئے۔

بیرسٹر عرفان نے مجھ سے بات کی تو میں نے گروی رکھنے سے انکار کر دیا۔ کہہ دیا کہ جتنی رقم تمہاری نگہداشت کے لئے چاہئے مجھ سے لیتے رہیں مگر میں کوٹھی گروی نہیں رکھوں گا۔ میرا ضمیر گوارا نہیں کر رہا تھا۔ اگر انکل کو مجھ پر اتنا اعتبار تھا تو مجھے بھی ان کی اکلوتی اولاد کا خیال تھا، تمہارا خیال تھا۔ یہ نہیں کہ میرے ذہن میں بابا کی پچھلی بات تھی ـــ نہیں ـــ میں نے اس پہلو پر کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ آج تم پر مصیبت ٹوٹی ہے میرے بابا کے دوست کی بیٹی پر۔ اور اُس کے لئے میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ خیر ـــ

بیرسٹر صاحب نے کہا کہ تمہاری خودداری کبھی یہ برداشت نہیں کرے گی کہ میں تمہاری کفالت مفت کروں۔ اور اس کے لئے مجھے کوٹھی گروی رکھنی ہی پڑے گی۔ میں نے اُن سے کہا کہ ہم دونوں پوز کر لیتے ہیں کہ کوٹھی میرے پاس گروی ہے۔ یہ بھی کہا کہ مشعل کو ملک سے باہر جا کر بے آرام ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ رہے اپنی کوٹھی میں بمعہ اپنے تمام ملازموں وغیرہ کے اخراجات اُسے ملتے رہیں گے۔

ہم دونوں میں یہ بات تو تقریباً طے تھی کہ پتہ چلا نور خان کے عزائم اور بھی بہت کچھ ہیں۔ تمہاری کوٹھی پر بھی نظر ہے۔ مجھے تمہاری فکر لگ گئی۔ نور خان بہت اوباش شخص ہے۔ یہی اندیشہ انکل نے بھی مرنے سے پہلے چند روز قبل بیرسٹر صاحب پر ظاہر کیا تھا۔

سو ـــ فوراً ہم نے کاغذات تیار کروائے اور کوٹھی میں نے گروی رکھ لی۔ بیرسٹر صاحب نے تمہارے باہر جانے کا بندوبست کیا۔ اور میں نے تمہاری غیر موجودگی کی صورت میں حفاظت کے خیال سے تمہاری کوٹھی پر اپنے گارڈز متعین کرتے ہوئے کوٹھی اور اُس کی ہر چیز اپنی تحویل میں لے لی۔ تاکہ نور خان یہ تمام کاروائی دیکھ کر اس کی طرف سے بے آس ہو جائے۔

یہی سب وضاحت کرنے اور بتانے کہ میں نے یہ سب مجبوراً کیا ہے تمہارے بھلے کی

خاطر، میں تمہیں ملنے آیا تھا۔

مگر تم مجھ سے ملنے سے انکار کر کے گھر سے نکل چکی تھیں۔ میں رحمت بابا سے ملا، اُن کو اور باقی تمام ملازمین کو وہیں رہنے کی تاکید کی، اپنی اپنی ڈیوٹی پر۔ سب کو تنخواہیں دیں۔ انہیں سمجھایا کہ یہ گھر اب بھی انہی لوگوں کا ہے، اِسے اپنا سمجھیں اور اس کا خیال رکھیں اور ـــ یہ بھی کہ یہ کوٹھی اور یہاں کی ہر چیز مشعل کی ہی ہے۔ میں تو صرف رکھوالی کرنا چاہتا ہوں اُس کی بھی اور کوٹھی کی بھی۔

اُسی روز دوپہر کی فلائیٹ سے میں اپنے جزیرے پر چلا گیا۔

ایک دو روز بعد میں آنٹی کو سلام کرنے گیا، انہیں میں ہمیشہ اپنے بزرگوں کی طرح سمجھتا رہا ہوں۔ وہیں بیرسٹر صاحب کا تمہارے وہاں پہنچنے کے متعلق تار ملا۔ مجھے بیرسٹر صاحب نے بتایا تھا کہ وہ تمہیں ذوالفقار انکل کی وصیت کے مطابق ملک سے باہر کسی جزیرے پر ان کی منہ بولی بہن کے پاس بھجوا رہے ہیں مگر ـــ

یہ جان کر کہ انکل کی منہ بولی بہن مسز سراج ہیں اور تم میرے ہی جزیرے پر پہنچنے والی ہو عجیب اتفاق لگا۔ ساتھ ہی گہرا دکھ بھی ہوا۔ تم جن حالات سے دوچار ہو کر وہاں آ رہی تھیں اور پھر جس محدود وسائل والے ماحول میں تمہیں وہاں رہنا تھا اُس کا مجھے بہت افسوس ہوا۔

مگر ـــ ساتھ ہی ایک طرح کی تسلی بھی ہوئی۔ ماحول جیسا بھی تھا، یہاں اکیلے دشمنوں میں گھرے رہنے سے کہیں بہتر تھا۔

اور پھر ـــ وہاں میں تھا، جزیرہ بھی میرا تھا۔ میں تمہارا ہر طرح کا خیال رکھ سکتا تھا جیسا تمہارے آ جانے پر میں نے اپنے خاص ملازموں کو چوکس رہنے کا کہہ دیا تھا اور جزیرے پر میری عدم موجودگی میں دو گارڈز ہر رات کو آنٹی کے گھر کے پاس والے چھپر میں پہرہ دیا کرتے تھے۔ مگر...‘‘۔

اور ___ مشعل کو پھپھو کی اُن دو آدمیوں سے خوفزدہ ہونے، ان کی حالت مشکوک لگنے اور تھر تھر کانپتے رات گزارنے والی بات یاد آ گئی۔

"ساتھ ہی خیال آیا کہ تم نے تو مجھ سے ملنے تک سے انکار کیا تھا۔ شاید میری شناخت تمہیں بار گزرے، میں نے آنٹی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں تمہیں پہلے سے جانتا تھا۔ مبادا سیدھی سی ہیں تمہیں بتا ہی نہ دیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ تمہیں میرے جزیرے کی ملکیت کے بارے میں بھی نہ بتائیں، یہ نہ ہو کہ تمہاری خودداری کو ٹھیس پہنچے، میری آسائشیں دیکھ کر تمہیں اپنی محرومیوں کا احساس ہو، تم اپنے آپ کو کمتر محسوس کرو...

سوتم"۔ شیر شاہ نے گہری سانس لی۔"وہاں رہنے لگیں ساتھ ہی ساتھ ___ میرے دل میں بھی"۔ مسکراتے ہوئے وہ خاموش ہو گیا۔

اور ___ مشعل کا انہماک ٹوٹا۔

کتنا عظیم تھا وہ۔ کتنا بلند۔ کتنا اونچا۔ اس کا پیار یوں پوجا میں بدلنے لگا۔

"ساتھ ہی ساتھ بیرسٹر صاحب کی مدد سے میں انکل کا کیس تیار کرتا رہا۔ درمیان میں آ کر اُن کا مقدمہ لڑتا رہا..."۔

"آپ نے کبھی نہیں بتایا کہ آپ وکیل بھی ہیں"۔ وہ آہستہ سے بولی۔

"بیرسٹر۔ لیکن بہت کبھی کبھی۔ اکا دکا کیس، جو دلچسپ ہو اور میں فارغ۔ یا پھر انکل کا کیس تھا۔ رہی بات تمہیں بتانے کی تو ___ اتنی سی چیز کے ساتھ میں سوائے برگر اور آئس کریم کے کچھ اور ڈسکس کرنا نہیں چاہتا تھا"۔

"اب اتنی بھی چھوٹی نہیں ہوں"۔ مشعل نے احتجاج کیا۔

"بس اتنی چھوٹی ہو ___ کہ میں نے خوب خوب ENJOY کیا ہے"۔ وہ بے اختیار ہنس دیا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ۔ عام حالات میں تو میں تمہیں ایک دن بٹھا کر سب بتاتا۔ کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس کے پاس تمہاری کوٹھی گروی ہے۔ اور یہ کہ میں تمہاری جائیداد کا بھی مقدمہ لڑ رہا ہوں۔ وقتاً فوقتاً تمہیں پروگریس سے آگاہ بھی کرتا ___ مگر ___

تمہیں مسٹر خان کو گالیاں دیتے سنکر مجھے اور بھی اچھا لگا کہ تم مجھے نہ پہچاننے کی وجہ سے مجھے میرے سامنے بیٹھ کر گالیاں دیتی رہتی ہو۔

اچھا ہی ہوا کھل کر بات نہ ہوئی ورنہ شاید یہ راز بھی کھل جاتا کہ تمہاری پراپرٹی سیل کروانے والا مسٹر نور خان اور میں شیر شاہ خان دو الگ آدمی ہیں۔ پھر میں اتنا انجوائے ہی نہ کر پاتا۔

میں تو یہی سمجھا تھا کہ تم صرف کوٹھی گروی رکھنے پر ہی اتنے غصہ میں ہو"۔

وہ خوبصورتی سے ہنسا۔ قدرے رُکا۔

"ہاں تو تمہاری گالیوں کی پہلی بوچھاڑ کے بعد یہاں آ کر میں نے کاغذات تیار کروائے اور تمہاری کوٹھی رہن سے آزاد کر دی۔ مگر جلد ہی اطلاع ملی کہ محترمہ مشعل صاحبہ کو ہماری نیک نیت پر شک ہوا ہے۔ اور حکم صادر فرمایا ہے کہ فوراً کوٹھی کے کاغذات واپس کر دیئے جائیں وہ کوٹھی کے بدلے اپنا سودا نہیں کروائیں گی مجھ سے..."۔

"تو ___ تو...؟"

وہ ہنس دیا۔ دلآویز ہنسی۔

"تم مجھے مسٹر خان۔ پراپرٹی سیل کروانے والا یا کوٹھی گروی رکھوانے والا یا دونوں۔ جو بھی 'خان' سمجھتی رہیں، میں بنا رہا۔ بڑے طریقے سے، تدریج سے تمہیں ڈرایا..."۔

"کیا مطلب؟" وہ پھر سے الجھنے لگی تھی۔

"پہلے میں نے کوٹھی کے کاغذات بیرسٹر صاحب کے سپرد کیئے۔ پھر تمہیں کہلوایا کہ مسٹر خان تم سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اور پھر آخر میں کہلوایا کہ تمہیں جزیرے سے اٹھوا بھی سکتا ہے"۔

"یہ آپ کرواتے رہے؟"

"ہاں"۔

"YOU...CHEAT"۔ وہ چلائی۔

"پھر اُس دن تو بہت ہی مزا آیا تھا۔ جب آنٹی کا تار ملا تھا کہ میں فوراً پہنچوں اور جب گیا تو تم اور آنٹی میری کوٹھی میں شفٹ ہوئی تھیں اور آنٹی بار بار کہہ رہی تھیں۔

"کچھ کرو بیٹا اِس موئے خان کا سچ مچ اٹھا کرلے گیا تو..."

"بس چپ"۔ اُسے مزید کہنے سے روکنے کو مشعل نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کچھ ہاتھ اس میں بیرسٹر صاحب کا بھی تھا"۔ اُس نے آہستہ سے مشعل کا ہاتھ اپنے منہ سے ہٹا دیا۔ "میں نے تم سے شادی کی خواہش ظاہر کی اُن کے سامنے، ساتھ ہی بابا اور انکل کی لندن میں ہونے والی گفتگو کا ذکر کیا۔ بہت خوش ہوئے سنکر، تمہیں معلوم ہے خاصے زندہ دل قسم کے ہیں۔ رحمت بابا کو پاس بٹھا کر خط لکھواتے رہے۔ میں نے جو بات مذاق میں بھی کہی ترنگ میں آکر تمہیں بابا سے لکھوا دی۔

"گوڈ"۔ مشعل اتنا ہی کہہ سکی۔

"یس میم"۔ گھنی پلکوں کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے وہ خوبصورتی سے ہنس دیا۔

تھوڑی دیر کے لئے مشعل کا ذہن مفلوج سا ہو گیا تھا۔ چپ چاپ بیٹھی اپنا سدھ بدھ سمیٹ رہی تھی جیسے۔

شیر شاہ بھی خاموش تھا۔ سیاہ بل کھاتی سڑک پر نظریں جمائے ڈرائیو کر رہا تھا۔

"ہم لوگ یہاں پہنچے تو ـــــ آپ نے خبر ہی نہیں لی"۔ حواس کچھ مجتمع ہوئے تو مشعل کی زبان پر شکوہ آ ہی گیا۔

"خیر ـــــ میں تو پل پل کی معلومات رکھتا تھا۔ صبح شام تمہارا حال پوچھتا تھا بیرسٹر صاحب سے"۔

"مبارکباد تک نہیں دی..."۔

"مبارکباد تو مجھے ملنی چاہیئے تھی۔ انکل کا کیس جیتنا کوئی آسان کام نہیں تھا"۔

"وہ تو ہے مگر..."۔

"میں تنگ کر رہا تھا تمہیں اور کچھ نہیں"۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

"مجھے تنگ کر کے کیا ملا آپ کو"۔

"تمہارا رونا۔ جو میرے پیار کا اقرار تھا"۔ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ خوبصورت، مدھر مسکراہٹ۔

"دراصل میں انتظار کر رہا تھا کہ تم بیرسٹر صاحب کے گھر سے اپنی کوٹھی میں شفٹ ہو جاؤ، ذرا سیٹل ہو جاؤ تو میں بات کروں گا۔ مگر پرسوں رات تمہیں ڈنر پر دیکھا تو ـــــ تمام رات بار بار تمہاری شکل نظروں کے سامنے آتی رہی۔ بس ـــــ میں"۔ وہ ہنس دیا۔ "میں بیقرار ہو گیا، اور زیادہ صبر نہ کر سکا۔ صبح ہی صبح تمہیں پروپوز کرنے کو فون اٹھایا۔ پھر جانے کیا ہوا۔ تمہیں تنگ کرنے کا دل چاہا، تقریباً سارا دن لگا رہا ـــــ مگر ـــــ پھر تم پر ترس آ گیا۔ اس سے زیادہ تم سہہ سکتی تھیں نہ میں تاخیر چاہتا تھا..." وہ اب بھی ہنس رہا تھا۔

مشعل بھی مسکرا دی۔ رُخ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

شام کے اندھیرے تیزی سے پھیل رہے تھے۔ آبادی بہت پیچھے رہ گئی تھی اور آگے۔ کار کی ہیڈ لائٹس کی زد میں دور تک جاتی سیاہ سڑک تھی اور بس۔

''وہ فون واقعی آپ کر رہے تھے؟'' اُسے اچانک پھر خیال آیا۔ رُخ پھیر کر اُسے دیکھنے لگی۔

''تمہیں یقین نہیں آتا''۔

''مگر آپ کی آواز اتنی بدلی ہوئی تھی، ہنسی بھی اتنی گندی سی...''۔

''آواز میں نے خود بدلی تھی اور ہنسی کی گندگی تمہاری اپنی سوچ کی پیدا کردہ تھی۔ تم چونکہ نور خان کو دیکھ آئی تھیں اس لئے سب اُسی کی طرح لگ رہا تھا ورنہ اپنے آپ کو 'خان' کہتے ہوئے میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم مسٹر خان کو نورخان سمجھتی رہتی ہو''۔

''آپ کو پتہ ہے آپ کے فونز سے میں کتنی خوفزدہ تھی''۔

''میں تو ENJOY کر رہا تھا''۔

''مجھے کچھ ہو جاتا تو؟''

''اسی لئے تو میں اتنی جلدی سنبھالنے آ گیا۔ ورنہ یہ کھیل دنوں جاری رہ سکتا تھا''۔

''نہیں''۔ وہ اب بھی لرز سی گئی۔

''اچھا نہیں ___ بس''۔ وہ خوشدلی سے ہنس دیا۔

''ویسے ___ کتنا مکروہ سا آدمی ہے وہ''۔ اُس کی شکل وصورت، لب ولہجہ کا خیال آتے ہی اُسے کراہت سی آنے لگی۔

''اب تو جو ہوا سو ہوا۔ آئندہ اُس راستے سے بھی مت گزرنا۔ وہ مانا ہوا بدکردار انسان ہے''۔

اور ___ مشعل کو جیسے اچانک یاد آیا۔

''وہ مجھ سے کہہ تو رہا تھا۔ میری تجویز آپ کے گوش گزار کی بیرسٹر عرفان نے یا نہیں؟'' وہ الجھ سی گئی۔

اور شیر شاہ کا زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

''وہ تجویز بھی اُس کا گھٹیا پن ہی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ذوالفقار انکل کی بجائے اب تم اُس کی بزنس پارٹنر بن جاؤ۔ پھر سے شراکت کر لو۔ جبکہ اتنا سب کچھ کرنے کے بعد اُسے یہ بات زیب نہیں دیتی تھی۔ اور اسی لئے شاید بیرسٹر صاحب نے تم سے ذکر بھی نہیں کیا...''۔

''یہ تجویز تھی اس کی...''۔

''مگر تمہارے تو ذہن پر مسٹر خان کچھ ایسا سوار تھا کہ اس بچارے کی بزنس کی تجویز بھی تمہیں شادی کی تجویز لگی''۔

''ویسے وہ بچارا نہیں ہے''۔ مشعل دھیرے سے بولی۔

''بڑے پست کردار کا آدمی ہے۔ اُس سے کچھ بھی بعید نہیں''۔

اور ___ مشعل کو ایک بار پھر جھرجھری آ گئی۔ اس کی سیکرٹری کا ننگا لباس، گلاس میں وسکی انڈیلتا گنجا آدمی، میوزک..... معاً وہ سوچوں سے چونکی۔

شیر شاہ نے پکی سڑک چھوڑ کر گاڑی دائیں کچے راستے پر ڈال دی تھی۔

''اور آج کے بعد۔ تم ہر بات بھول جاؤ۔ صرف یہ یاد رکھو کہ میں ہوں تمہارے پاس، تمہارے ساتھ، تمہارے لئے''۔ اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر اپنے ہونٹ اس کے بالوں پر رکھتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا۔ ''کل شام سادگی سے ہمارا نکاح ہو جائے گا اور۔ اگلے ہفتے ہم دونوں اپنے آئی لینڈ پر چلے جائیں گے''۔

گم سم سی مشعل نے اِرد گِرد نگاہ کی۔

ہر سُو اندھیرا پھیل چکا تھا، دور دیو قد آور چنار سائیں سائیں کر رہے تھے اور ___ قدرے فاصلے پر ___ دیو قامت درختوں میں گھری پتھروں کی بنی اونچی قلعہ نما حویلی میں سے چھن چھن آتی مدھم روشنیاں پُراسرار لگ رہی تھیں۔

''مجھے گھر جلدی لے جائیں گے اچھا''۔

اور ___ شیر شاہ کو ہنسی آ گئی۔ اُسے مشعل سے اپنی پہلی ملاقات یاد آ گئی۔ بوٹ سے اُتر کر وہ لوگ جزیرے پر آنٹی کے گھر کی طرف چلے تھے، تو بھی سائیں سائیں کرتے ماحول سے وہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔

''آں ___ گھنٹہ بھر ڈنر کا انتظار کرنا ہو گا، پھر ڈنر، پھر میوزک، کچھ گپ شپ ___ تین چار گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے...''۔ وہ چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔

''نہیں ___ میں...''۔

اور ___ حویلی کے عقب سے یہ بڑا چاند نمودار ہو گیا۔

ہر سُو مدھر چاندنی پھیل گئی۔ دورویہ قد آور چنار منور ہو گئے اور ___ دیو قامت درختوں میں گھری پتھروں کی بنی اونچی قلعہ نما حویلی نور میں نہا گئی۔

''اب تو رُک جاؤ نا''۔ اُسے بازو کے گھیرے میں لئے ہنوز اُس کے سیاہ گھنے بالوں میں چہرہ دیئے الف لیلوی ماحول سے مسحور وہ دھیرے سے بولا۔ ''اب تو چاند بھی نکل آیا ہے''۔

مگر ___ رات، تنہائی اور سحر زدہ ماحول مشعل کو برابر بوکھلائے دے رہے تھے۔

''میں ___ پھر آؤں گی نا''۔

اور ___ بچوں کی طرح بہانہ بناتے ہوئے وہ اُسے اور بھی اچھی لگی۔

''کل؟'' اُس کا اشارہ اپنے نکاح کی طرف تھا۔

''ہاں''۔ شرما کر اس نے اس کے سینے میں چہرہ چھپا لیا۔

''یہ ہوئی نا بات''۔ وہ بہت محظوظ ہوا۔ ''ڈنر کے فوراً بعد میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔ ویسے بھی ___ بابا کہتے تھے اس حویلی میں کوئی لڑکی رات اس وقت تک نہیں گزار سکتی جب تک کہ اس کا مجھ سے نکاح نہیں ہو جاتا''۔ وہ شریر انداز میں کہہ رہا تھا۔ اور اپنے بابا کا ہر حکم میں نے ہمیشہ

بلا چوں و چراں مانا ہے''۔

بابا کا ایک حکم مشعل کو اپنانے کا بھی تھا۔ اس نے بڑی خوبصورتی سے اشارہ دیا تھا۔

مشعل اب بھی اس کے سینے میں چہرہ چھپائے تھی۔ وہ اب بھی اُسے بازو کے حلقے میں لئے ___ آہستہ آہستہ حویلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔



☆ وہ یقیناً ایک کرخت، بدتمیز، نیم پاگل شخص تھا۔ جسے آبادی سے دور اس ویرانے میں چٹان سے ٹکراتی دریا کی منہ زور موجوں کے شور میں سکون ملتا تھا اور جو اس جھاڑ جھنکار، ویران اجاڑ بھوت بنگلے میں خوش تھا۔

یہاں رہنے کا، اُسے خریدنے کا کیا راز ہو سکتا تھا؟

☆ پہلی بار جب وہ اُس سے ڈنر ٹیبل پر ملی تھی۔ تو اُسے دیکھ کر وہ ساکت کیوں ہو گیا تھا؟ اُس کی پلکیں جھپکنا کیوں بھول گئی تھیں؟ وہ بول کیوں نہ پا رہا تھا؟

☆ لالٹینوں کی مدھم روشنی میں اُس نے دیکھا۔ لمبے قد اور چوڑے شانوں والا ایک شخص اوورکوٹ پہنے، کالر اوپر اٹھائے برآمدے کی طرف بڑھا تھا۔ نوکروں کی پریڈ اور روشنی کی کمی کی وجہ سے وہ ٹھیک سے اس کا چہرہ نہ دیکھ پائی۔ ہاں یہ ضرور معلوم ہوا کہ......

☆ وہ اُس کی رائیٹنگ ٹیبل کے پاس آئی۔ بڑے مزے سے ریوالونگ چیئر پر بیٹھی، ایک کتاب اٹھائی، اوراق پلٹنے لگی اور..........

اور..........پھر جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ کتاب میں ایک لڑکی کی تصویر تھی.....مگر یہ تو اس کی تھی، خود دلآرام کی!

'مسکرائی بہار' آمنہ اقبال احمد کی منفرد طرزِ تحریر میں ایک اور خوبصورت اضافہ ہے۔



☆ ویٹرس جواب میں جانے کیا بولی؟

ایک جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

مارے حیرت کے گھبرا کر وہ اسے دیکھنے لگی۔

وہ تو انسان تھا___ ہنسنا بھی جانتا تھا۔

اس کی سٹون گرے آنکھیں ناجیہ کی آنکھوں سے ملیں۔

قہقہہ اچانک تھم گیا۔ پُرکشش ہنستے مسکراتے نقوش تاریکیوں میں ڈوب گئے اور___ ناجیہ کو لگا___ وہ اس آدمی پر بوجھ تھی۔ کیسے؟ یہ اس کی سمجھ سے باہر تھا؟

☆ باہر آسمان میں آتش بازیاں ہو رہی تھیں، پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے۔ بارش کی جیسے چادر تن گئی تھی جو آسمان سے شپ اور شپ سے لیڈنگ سٹیج پر ایک دھماکہ خیز آبشار کی مانند گر رہی تھی۔ باوجود مضبوطی سے بندھے ہونے کے دیوقامت شِپ کاغذ کی ناؤ کی طرح ڈانواں ڈول ہو رہا تھا۔

معاً زور کی گرج ہوئی، کئی بجلیاں ایک ساتھ تڑپیں، جیسے شعلے سے لپکے۔ اس کا تمام کیبن روشن ہو گیا۔

مارے خوف کے وہ اٹھی۔ اور بھاگی...

☆ وہ کم بول رہا تھا۔ مختصر جملے، ذو معنی دلچسپ۔

کچھ دیر قبل کے اس کے چہرے پر تاریکی کے سائے، آنکھوں میں تضحیک یا کرب کا اب شائبہ تک نہ تھا۔

تو کیا اس کی ناگواری، بے اعتنائی صرف ناجیہ کی ذات تک محدود تھی؟ پر کیوں؟ وہ تو اسے جانتا تک نہیں تھا!

بحری جہاز پر سفر کے دوران پروان چڑھنے والی لازوال محبت کی داستان

'عجیب شخص ہے' آمنہ اقبال احمد کی ایک حسین تخلیق ہے۔



☆ پورچ میں کھڑی وہ اپنی خوبصورت سپورٹس کار کی طرف بڑھی مگر ___ دوسرے ہی لمحے وہاں کھڑے دو اجنبی گارڈز کو اپنی طرف گھورتے دیکھ کر ___ وہ پیچھے ہٹ آئی۔ احساس ندامت سے اداس چہرے پر زردی کھنڈ آئی۔ محرومیت کے خیال سے خوبصورت آنکھوں میں کرب اتر آیا۔

☆ معاً ___ وہ مرغیوں کی پھڑ پھڑاہٹ سے چونکی۔ مڑ کر دیکھا۔ ایک کے بعد دوسری، مرغیاں بڑے مزے سے دین سے نیچے کود رہی تھیں۔ اس نے فوراً گاڑی روک لی۔ نیچے اتر آئی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" وہی آدمی تھا۔ اس شام والا جسے پھپھو نے اسے لینے ائیر پورٹ بھیجا تھا۔

"پولٹری دینے"۔

"کون باقی رہتا ہے؟"

"مالک باقی رہتا ہے"۔

"لائسنس بھی ہے تمہارے پاس؟"

"کیوں؟"

"مالک کے یہاں جاؤ گی تو وہ لائسنس دیکھے بغیر گھسنے دے گا؟"

☆ گھوم پھر کر اس کی سوچ اس آدمی پر آ ٹکی۔ کتنا سوبر تھا، سنجیدہ اور ___ جانے کیوں وہ بے اختیار ہنس دی۔ وہ تو ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ بھی روک لیتا تھا۔ اس قدر سختی سے جڑے ہوئے جبڑوں میں درد تو ضرور ہوتا ہوگا!

☆ "وہ دور جو سبز لکیر سی نظر آ رہی ہے نا"۔ اس نے دور اس پار اشارہ کیا۔ "یہ دراصل اسی جیسا دوسرا جزیرہ ہے۔ مگر اس پر کوئی آباد نہیں۔ یہاں تمہیں بیشتر جزیرے خالی نظر آئینگے۔ ساحل کی ریت سے کچھ فاصلے پر کسی کے قدموں کے نشان دکھائی دیں گے تو تھوڑی دیر بعد احساس ہوگا کہ یہ تو اپنے ہی قدموں کے نشان تھے......" وہ بہت دلکش انداز میں اسے بتا رہا تھا۔

ایک خوابناک جزیرے میں پروان چڑھتی محبت کی خوبصورت داستان

'اک لڑکی چھوٹی سی' آمنہ اقبال احمد کی منفرد طرز تحریر میں ایک اور حسین اضافہ ہے۔

☆ "سر۔ دو قدم پیچھے ہٹ جائیں" اچانک NCO نے رک کر اُسے خبردار کیا۔ "فاتحہ پڑھیں یہاں"۔

اُس نے دیکھا۔ اُس جگہ برف پر یہاں وہاں دو بیک پیکس پڑے تھے۔ وہ واقعی پیچھے ہٹنے لگا۔

"کیا بات ہے؟" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"سر۔ پرسوں یہاں دو بندے تودہ گرنے سے دب کر شہید ہوئے ہیں"۔

"اوہ"۔ اُسے جھر جھری سی آ گئی۔ دونوں ہاتھ خود بخود فاتحہ کے لئے اٹھ گئے۔

☆ "یہ مل جائے نا اور ایک گاڑی۔ بس زندگی بن جائے گی"۔ کیپٹن سالار میس میں بیٹھا ٹی وی سکرین پر آتی ایک حسین ماڈل پر نظریں جمائے بولا۔

☆ پھر۔ اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اُن کا چھوٹا سا مسکن SUBARCTIC ہواؤں میں تیر رہا تھا جیسے۔ اِگلو کے پتلو چمک چمک۔ چمک چمک۔ کر رہے تھے اور برف کے جھکڑ سیٹیوں کی پراسرار آوازیں پیدا کر رہے تھے۔

☆ "LONESOME HIGH"۔ سیاہ پتھروں کے بنے چھوٹی کھڑکیوں اور ڈھلانی چھتوں والے دو منزلہ پرانے طرز کے بنگلے پر لکھا تھا۔ آس پاس کا تمام اسرار تمام سحر جیسے سمٹ کر اس نام میں سما گیا تھا۔ وہ مسحور سا ہوا۔

☆ "سر۔ یہاں احتیاط سے چلیں۔ ہم دشمن کی پوسٹوں کے نیچے سے گزرنے والے ہیں"۔ این سی او نے اُسے وارن کیا۔ "ہو سکتا ہے گلیشیئر کے اس حصے میں ہمارا دشمن کی فائر سے اینکاؤنٹر ہو.............. اگر ایسا ہوا اور بلٹس اور راکٹس ہماری طرف آنے لگیں۔ تو ایک بات یاد رکھیں سر۔ بھاگنے کی کوشش بالکل مت کریں"۔

☆ وہی لڑکی سامنے کھڑی تھی۔ وہی اپنی حرکت پر نادم، وہی سہمی سہمی، وہی گھبرائی گھبرائی۔

☆ ساجن کے سولجر کا نیچر کسی بھی پل فراسٹ بائیٹ بن کر اُسے زندگی بھر کے لئے اپاہج بنا کر تصویر یاس بنانے پر تلا بیٹھا تھا۔ کسی بھی لمحے اپنے سنو کورڈ کریویسز میں منہ کھولے اُسے نگلنے پر مصر تھا اور کسی بھی ثانئے اپنے خونخوار ایولانچ میں لپیٹ کر اُسے ٹنوں برف تلے دفنانے پر کمر بستہ تھا۔ جہاں اُس کی روح چیختی رہتی تھی، مدد کے لئے پکارتی رہتی تھی اور... قیامت کے دن کا انتظار کرتی رہتی تھی!

☆ "لڑکی شکل کی کیسی ہے"؟ کیپٹن ثاقب پوچھنے لگا۔

☆ یہ تو اس نے سالار کو بھی نہیں بتایا تھا۔ سیاہ۔ تشنگی آنکھیں پوری کھول لیں۔ پرکشش لبوں پر شریر

مجھے دیکھ کر بدحواس ہوگئی۔بس...‘‘۔اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔’’سب بیکار سمجھا...‘‘۔

تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔

اور ــــ شیر شاہ کی اجازت پا کر ــــ ملازم ڈاکٹر کو اپنی ہمراہی میں لئے اندر آ گیا۔

ڈاکٹر نے اس کی پٹی بدلی۔ٹمپریچر نوٹ کیا،اب بھی خاصا تھا۔وہی دوائی جاری رکھنے کو کہا۔آرام کرنے کی تاکید کی۔

اور ــــ واپس چل دیا۔

’’میں چلوں اب‘‘۔بالکنی کے پاس سے وہ اُس کے قریب چلی آئی۔

’’کل آؤ گی نا‘‘۔ایک بار پھر اس کا ہاتھ ہونٹوں سے لگا لیا۔

’’ہاں‘‘۔نظریں جھکائے وہ دھیرے سے بولی۔

’’اچھا ــــ پیار کرو یہاں‘‘۔اس نے اپنے گال کی طرف اشارہ کیا۔

سُرخ ہوتے ہوئے وہ ــــ جھکی ــــ

اور ــــ آہستہ سے اپنے نازک ہونٹ اس کے گال پر رکھ دیئے۔

اُسے بےخود سا چھوڑ کر ــــ وہ باہر آئی ــــ اور وین میں بیٹھ کر باقی کی پولٹری تقسیم کرنے چل دی۔

شیر شاہ وطن گیا تھا۔مشعل سے ملتا ہوا گیا تھا۔اُسے وطن آ کر رہنے کی تاکید کی تھی ــــ اپنی کوٹھی نہ سہی وہ شیر شاہ کے فارمز پر آ کر قیام کرتی۔وہ تو یوں بھی شہر میں رہتا تھا،اپنے مرحوم والد کا کاروبار سنبھالے تھا۔شاذ ہی فارمز پر آتا تھا۔

بڑی حویلی تھی،ملازم،مامائیں تھیں۔فارم تھا اصطبل تھا۔اپنے گھر سے ملتا جلتا ماحول پا کر وہ یقیناً خوش رہتی وہاں۔

’’اور یوں ــــ تم میرے قریب رہو گی،مجھے تسلی رہے گی‘‘۔وہ اپنائیت سے بولا تھا۔

مگر ــــ میں وہاں اکیلی کیسے رہ سکتی ہوں۔پھر ــــ پاپا کی بھی یہی خواہش تھی کہ اُن کے بعد میں پھپھو کی نگرانی میں رہوں‘‘۔

اور ــــ یہاں آ کر شیر شاہ نے ہتھیار ڈال کر دیئے تھے۔اُس کے پاپا کی خواہش بہرحال مقدم تھی۔

’’ٹھیک ہے‘‘۔وہ مسکرایا۔’’پھر تمہارے ساتھ ساتھ کسی دن میں پھپھو کو بھی یہاں سے لیتا چلوں گا‘‘۔

اور یوں ــــ کوئی حل نہ پا کر ــــ اُس نے ایک ہی ماہ بعد واپس جزیرے پر اُس کے پاس آنے کا وعدہ کر لیا تھا۔

دن بےکیفی سے گزر رہے تھے۔معصوم سی مشعل ــــ جو کبھی لاپرواہ، لاابالی ہوا کرتی

سی مسکراہٹ مچل اٹھی۔ "بہت خوبصورت" SHE IS A PARAGON OF BEAUTY" چاہتے ہوئے بھی جیسے وہ حقیقت چھپا نہیں سکا تھا۔

☆ "رات ایک عجیب واقعہ ہوا"۔ وہ قریبی پوسٹ پر ثاقب کو فون پر بتانے لگا۔ "آدھی رات کو اچانک باہر شور سنائی دیا۔ ہم سب نے فوراً ہتھیار اُٹھائے۔ اگلو سے باہر لیٹتے ہوئے پوزیشنیں سنبھال لیں۔ تب گارڈ نے بتایا کہ دشمن نہیں تھا۔ ہوا یہ تھا کہ پہرہ دیتے وقت کہیں اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ کہتا تھا اتنے میں اُس کو کسی نے زور سے تھپڑ مارا۔ دیکھا کہ سفید کپڑوں میں ملبوس بندہ ہے۔ کہتا ہے اس پوسٹ کی حفاظت کی خاطر ہم نے اپنی جانیں قربان کردی ہیں۔ اور تم سو رہے ہو۔"

☆ "تو چپ کر۔ تجھے تو میں نے رنگے ہاتھوں جوگنگ ٹریک پر گرل فرینڈ کے ساتھ پکڑا تھا"۔ کیپٹن آصف نے کہا۔

☆ "ڈیم اِٹ۔ کینڈل لائیٹ میں بھی کبھی حلوہ بنا ہے" کیپٹن نوید نے اُسے اُس کی گڑبڑاہٹ یاد دلائی۔

☆ "ہاں نا سر۔ کینڈل لائیٹ میں تو صرف ڈنر اچھا لگتا ہے وہ بھی کسی لڑکی کے ساتھ۔"

☆ "سر۔ اپنے قدم کا خیال رکھیں۔ راستے میں کریویسز کا خطرہ ہے۔ سنو کی پتلی سی تہہ میں چھپے ہوتے ہیں۔ اندھیرے میں نظر نہیں آتے۔"

THE MONSTERS IN THE DARK! اُس نے سوچا۔

☆ "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں آنٹی سمجھ نہ گئی ہوں کہ میں آپ کے پاس آئی تھی ــــــ اب تو مجھے نیند بھی نہیں آئے گی" وہ گھبرائی سی لگنے لگی۔

"وہ مسکرا دیا۔ دلآویزی سے۔

"SLEEP TIGHT, PAKISTAN ARMY IS AWAKE" ۔ اس نے خوبصورتی سے کہا۔

'ذہینہ' کے بعد اب 'سولجر' ـــــــ

ایک فوجی افسر اور اُس کے جوانوں کی سیاچن میں بیس ہزار فٹ بلند پوسٹ پر پل پل خطرات، لحہ لحہ سنسنی خیز واقعات، بے شمار قہقہوں اور لازوال محبت کی داستان ہے۔

'سولجر' آمنہ اقبال احمد کی ایک اور خوبصورت تخلیق ہے۔